Edited

8/10

سلسلۂ انجمن ترقی اُردو نمبر ۱۲۳

پیامِ شباب

یعنی

قاضی نذر الاسلام کی بنگالی نظموں کے ترجمے

مترجمہ و مرتبہ

سیّد اختر حسین رائے پوری

شایع کردہ

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء

خانصاحب عبداللطیف نے لطیفی پریس دہلی میں چھاپا

اور

منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) نے دہلی سے شائع کیا

فہرست

انتساب

مستقبل کے شاعر کے نام ——

تو وہ سُورج ہے جو بدلی بھرے آسمان پر طلوع ہوا ہے۔
جس رنگین صبح کو دیکھنے کے لیے میں رات بھر جاگتا رہا تھا۔
تو بھی اُسی کے انتظار میں محو ہے۔
تیری آمد کی آس میں مَیں یہ داغ بیل ڈال رہا ہوں،
یاد رکھ کہ مَیں جس آسمان کی تخلیق کر رہا ہوں،
تو اُسی میں جگمگائے گا۔
میں اپنے سلام کی یاد چھوڑ رہا ہوں،
تو میری ہی بنسی پر نئے زمانہ کی راگنی بجایا کرنا۔

نذرالاسلام

[illegible]

مقدمہ

ہند جدید کی تاریخ میں جنگِ عظیم کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہی۔ قومی تحریکیں جو یہاں وہاں چھوٹے بڑے چشموں کی صورت میں بہ رہی تھیں اب ایک عمیق اور وسیع دریا کی شکل میں اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگتی ہیں قومیت ایک بہت بڑے گروہ کے لیے فلسفۂ زندگی بن جاتی ہی اور حیات کے اُن شعبوں پر بھی اپنا اثر ڈالنے لگتی ہی جو بظاہر مادّی تحریکوں سے بے نیاز ہیں۔ ہندستانی مصوّری اور موسیقی کے لیے رجحان اس امر کے شاہد ہیں۔

ہماری قومیت کا تمدّنی سانچہ بنگال میں تیّار ہُوا تھا۔ ہند جدید کا سب سے پہلا ریفارمر راجہ رام موہن رائے وہیں پیدا ہُوا۔ مغربی علوم و فنون کا چرچا پہلے پہل وہیں شروع ہُوا۔ اور ۱۸۵۷ء کے بعد سیاسی و سماجی اصلاح کی صدا بھی وہیں سے بلند ہوئی۔ جنھوں نے یورپ کے ریفارمیشن (Reformation) کی تحریک کا مطالعہ کیا ہی اُنھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہی کہ تاریخ زمان و مکان کی قیود سے کتنی آزاد اور انسان کی جد و جہد کی کس قدر مطیع ہی۔ ہزاروں میل کی دوری اور صدیوں کے فصل کے باوجود ارتقا کی وہی روش دو مختلف موقعوں اور جگہوں میں اپنا کام کرتی ہی۔ یعنی یورپ میں سینکڑوں

سال پہلے جن سیاسی و اقتصادی مطالبات کی وجہ سے نشاۃ ثانیہ اور سماجی اصلاح کی مہم شروع ہوئی تھی، تقریباً وہی نظارہ اب بنگال نے دیکھا۔ فرق یہ تھا کہ ہندستان میں دو تمدّن۔ہندو اور مسلم ۔۔موجود تھے اور اُن کے آگے ایک بدیسی سامراج کا مرحلہ درپیش تھا۔ بنگال کی قومی تحریک نے ابتدا میں اس مثلث کو جس طریقے سے سُلجھانا چاہا اُس کی مثال بنکم چٹرجی کے ناول ہیں۔ ان میں ہندستان کے لیے کسی واحد قومیت کا تخیل نہ تھا۔ مسلمانوں اور انگریزوں دونوں سے بیزاری تھی اور وطن کا وارث حقیقی ہندوؤں کو بتلایا گیا تھا۔ جنگِ عظیم تک یہ نقطۂ نگاہ کم و بیش باقی رہا اور اُس کی صدائے بازگشت ہم دستوری تحریکوں میں ہی نہیں بلکہ 'یگ بانی' اور تلک اسکول کی انقلابی تحریروں میں بھی پاتے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ بنگال میں برہمو سماج، رام کشن پرم ہنس وویکانند وغیرہ کے باطنی، انسانیت پسند اور لبرل خیالات بھی مقبول تھے۔ دیانند کی ویدک اور تلک کی گیتا والی جارحانہ تعلیم کے مقابلہ میں یہ لوگ اُپنشد کی امن پسند تعلیم کے علم بردار تھے۔ مگر دونوں کا مقصد ہندو نشاۃ ثانیہ اور قدیم ہندو تہذیب کی نئی زندگی تھی۔

بنگالی ادب کا موجودہ دور "ٹیگور کا عہد" کہلاتا ہے۔ ٹیگور کی شخصیت نے بنگالی ادب کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یوں تو

ادب کا ہر شعبہ اس کا منت پذیر ہے لیکن یہاں ہم صرف اُس کی شاعری کا ذکر کرتے ہیں۔

بنگالی مشرق کے اطالوی کہے جاتے ہیں۔ بڑی حد تک یہ تشبیہ صحیح بھی ہے۔ آب و ہوا نے ان دونوں قوموں میں رومان اور نغمے کی محبت پیدا کردی ہے، اگر دونوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ امن پسند ہیں اور اُن تمام چیزوں کے خوگر جو برسات اور گرمی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی زبانیں شیریں ہیں جن میں قدرے نسوانیت ہے۔ اُن کا ادبی ذوق حقیقت کی طرف نہیں بلکہ رومان اور ابہام کی طرف جاتا ہے اور غالبًا یہ سچ ہے کہ اطالیہ نے جتنے سینٹ اور بنگال نے جتنے سادھو اور سوامی پیدا کیے ہیں اتنے کہیں اور نہ ہوئے ہوں گے۔

ٹیگور کا کمال یہ نہیں تھا کہ اُس نے بنگال کی روح کو جِلا دی بلکہ یہ کہ وہ بنگال کی روح کو پاگیا۔ بنگالی زبان کی غنائی خوبیوں کو اُس نے سنوارا اور وہاں کی آب و ہوا کو اُس نے اپنی نظموں میں سمویا۔ اس کے لیے اُس نے مغربی اور قدیمی (سنسکرت) بحروں کو حسن خوبصورتی سے اپنایا اور بیان کے لیے جیسے نادر اسلوب پیدا کیے اُن کا شمار ادب عالم کے شہپاروں میں ہوسکتا ہے۔ شاعری کے قالب سے قطع نظر کرکے اگر ٹیگور کے نفس مضمون کی طرف آئیے۔ یہاں ہم جمود اور بے حرکتی کا وہی تماشہ دیکھتے ہیں جو گوتم بدھ اور ٹالسٹائے سے منسوب ہے۔ نظامِ زندگی کی بدعنوانیوں سے وہ تنگ تو ضرور ہے لیکن اس کا کوئی مداوا اُس کے پاس نہیں ہے

یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر سے آپ کسی "دوا" کی توقع کیوں رکھیں۔ لیکن ٹیگور کسی نہ کسی صورت میں "دُعا" پر ایمان رکھتا ہے۔ اور اگر کوئی مفکر ماضی و حال کی بے راہ روی کو سمجھتے ہوئے بھی مستقبل کو "دُعا" کے سپرد کر دے تو اُسے کیا کہا جائے۔

ٹیگور نے امن و عافیت کا جو طلسم کھڑا کیا تھا اُس کے گنبدوں میں کبھی کبھی وحشت پسندوں کے بم گونج اُٹھتے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ خواب جو کالی داس کے عہد سے شروع ہوا ہی جلد ٹوٹنے والا ہے۔ لیکن جنگِ عظیم کے خاتمے تک کوئی قومی تحریک عوام تک نہ پہنچی اور متوسط طبقہ بھی کُلّہم اُس سے متاثر نہ ہوا۔ ٹیگور کا جادو بنگال میں باقی رہا۔

عدمِ تعاون کی سیاسی تحریک ہماری تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے۔ اس لڑائی میں ہم نے جو حربے استعمال کیے اُن سے بحث نہیں۔ بلکہ یہ امر قابلِ غور ہے کہ انھیں استعمال کرنے والا ہمارا کسان تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مدّتوں سے سویا ہوا یہ کوہِ آتش فشاں جاگ اُٹھا ہے اور اپنے بندھنوں کو ابھی توڑ کر پھینک دے گا۔

ہم سب کو وہ دن ابھی بھولے نہ ہوں گے۔ سیاسی ہنگاموں کا تو کہنا ہی کیا۔ پارسی تھیٹر بھی "اندر سبھا" اور "لیلیٰ مجنوں" کو چھوڑ کر سودیشی اور سوراج کے گیت گانے لگے تھے۔ قوالیوں اور کیرتنوں سے ہندو مسلم اتحاد کی صدا آتی تھی۔ شاعروں کا لشکر حکومت برطانیہ کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور وہ حضرات جنھوں نے غزل کی مشاطہ گری میں ڈاڑھیوں کے بال سفید کر لیے تھے،

اب مجاہدانِ ملّت کے نئے روپ میں نظر آرہے تھے۔
بنگال جو تمام قومی تحریکوں کا جنم داتا تھا ہیجان کا خاموش تماشائی نہ تھا۔ ہندستان میں بنگالی سے زیادہ وطن پرست کوئی نہیں۔ اُس کا جوش اُس ندی کی طرح ہے جس کی جوانی مانسون کے دم تک ہے جب وہ اُمنگ میں آتی ہے تو اپنے سامنے کسی بند کو نہیں ٹکنے دیتی۔ اس ہنگامہ خیز دور میں وہاں جتنی سیاسی تحریریں قلم بند ہوئیں اُن کا شمار ناممکن ہے۔ یہ جوش تو آیا گیا ہوا، جو چیز باقی رہ گئی وہ نیا دور تھا جو بنگال کے آرٹ اور ادب کی دُنیا میں شروع ہوا اور اب تک چلا جا رہا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ زمانہ بڑے بڑے ہنگاموں اور انقلابوں کی یاد صرف اُن چند لکیروں اور محاوروں میں چھوڑ جاتا ہے جو کسی ملک کے طرزِ تعمیر اور طرزِ بیان میں رہ جاتے ہیں۔

اس نئے ادبی دور کے بانی اور علم بردار کا نام نذر الاسلام تھا۔

جنگِ عظیم کا زمانہ ہے۔ عراق کا میدان کارزار دِن بھر گرم رہ چکا ہے اور اب خدا خدا کرکے رات ہوئی ہے۔ ہر طرف سنّاٹا اور اندھیرا ہے۔ کبھی کبھی ہوائی جہاز دشمن کی ٹوہ لینے کے لیے نیچے روشنی پھینکتے ہیں دفعتًا بندوقوں کی آواز اور بموں کی شورش سے فضا گونج اُٹھتی ہے۔ پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ خندقوں میں سپاہی غفلت کی نیند سونے لگتے ہیں۔

مگر کسی خندق میں ایک سپاہی جاگ رہا ہے دن بھر مورچے پر وہ بڑی مستعدی سے لڑتا رہا ہے اور تھکان سے اُس کے بند بند ڈھیلے

پڑ چکے ہیں۔ پھر بھی اُس کی آنکھوں سے نیند کالے کوسوں دور کیوں ہی؟ اس بے کلی اور بے چینی کی وجہ کیا ہی؟۔ اسے خود نہیں معلوم! تھوڑی دوری پر شط العرب کا دھارا تیزی سے بہ رہا ہی۔ سپاہی نذرالاسلام صرف یہ محسوس کرتا ہی کہ اُس کے دل میں کچھ جذبات موجزن ہیں اور الفاظ کا لباس پہننا چاہتے ہیں اس سے پہلے اُس نے شاعری کی باقاعدہ مشق نہیں کی تھی اور بحر و قوافی کے گُروں سے ناواقف تھا۔ لیکن یہ وہ عالم ہی جسے شاعر والہام، سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ اندھیرے میں پنسل سے کاغذ پر کچھ لکھنے لگتا ہی اور صبح ان جملوں کو دیکھ کر اس کے حیرت و استعجاب کی حد نہیں رہتی۔ بلا ارادہ اُس نے ایک نظم لکھ ڈالی ہی۔ یہ اُس کی پہلی مطبوعہ نظم "شاتی العرب" ہی۔

نذر الاسلام ایک گم نام کسان گھرانے کا فرد تھا۔ بردوان کے کسی گانو میں آج سے ۴۲ سال پہلے وہ پیدا ہُوا۔ قدرت نے اُسے پالا اور غُربت کے سرد مہر ہاتھوں نے اُس کی تربیت کی۔ اسکولوں اور کالجوں کے عیش اُس کے نصیب میں نہ تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں بھرتی ہو کر وہ عراق چلا گیا۔ اور سچ پوچھا جائے تو یہی میدانِ جنگ اُس کے لیے سب سے بڑی تعلیم گاہ ثابت ہُوا۔

جب وہ لڑائی کے میدان سے حوالدار بن کر ہندوستان لوٹا تو اُس کے ساتھ چند نظموں کا مسودہ بھی تھا۔ اس دوران میں یہاں تحریک خلافت اور عدم تعاون کی سُن گُن شروع ہو چکی تھی۔ نذرالاسلام نے دیکھا کہ جو آگ دل میں چھپا کر وہ لایا ہی اُس کی لپٹیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور سارا ملک قربان گاہ بنا ہُوا ہی۔

بدنصیبی سے ہم ہنوز اُن اثرات اور اسباب سے ناآشنا ہیں جنھوں نے نذر الاسلام کے خیالات میں کایا پلٹ کردی اور اُن کے اظہار کا ذریعہ شاعری کو بنایا۔ ہمارے استفسار کے جواب میں وہ کہتا ہے "یہ کیوں پوچھتے ہو کہ طوفان کہاں اور کیوں کر پیدا ہوا" تاہم میدانِ جنگ میں لکھی ہوئی ان نظموں کو پڑھ کر اور اُس کے ماحول کو دیکھ کر ہم اُس کے رُجحان کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اُن کا مجموعہ "اگنی بنیا" (آگ کی بانسری) کے نام سے شایع ہوا تھا۔ یہ آٹھ یا نو نظموں پر مشتمل ہے جن میں سے دو کو چھوڑ کر باقی سب عراق میں لکھی گئی تھیں۔ یہ سب اسلامی روایات سے تعلق رکھتی ہیں اور اُن میں ہم اس مسلمان انقلابی کی جھلک دیکھ سکتے ہیں جس کی مثال اُس زمانے میں کمیاب نہ تھی اور جو ہندوستان سے زیادہ ترکی اور ممالک عرب کی آزادی کا خواہاں تھا۔ جو بھی ہو، یہاں اُس کی فطرت کا اصلی جوہر ہمیں ملتا ہے، جو آزادی کی لگن اور ظلم کی نفرت ہے۔

اُس کے ماحول کو دیکھو تو وہ ایک مسلمان کسان کا بیٹا ہونے کے ساتھ سپاہی بھی ہے۔ کسان سپاہی میں انقلاب گری کے بڑے بڑے امکانات پنہاں ہوتے ہیں بشرطیکہ اس کا ساتھ مزدور سے ہوجائے۔ کسان، مزدور اور سپاہی — ان تینوں کا اتحاد دُنیا کی تمام جابر سلطنتوں کا تختہ اُلٹ سکتا ہے۔ زار کا زوال اس حقیقت کا ثبوت ہے

مسلمان کی گرم گفتاری کسان کی حقیقت پسندی اور سپاہی کا جوش — یہ تینوں چیزیں نذرالاسلام کو ودیعت کی گئی تھیں۔ مزدور کی انقلابی سرشت کی کمی تھی، سو وہ بھی بعد میں پوری ہوگئی۔

ہندستان لوٹنے کے بعد نذرالاسلام کو اپنے خیالات کی تہذیب اور مطالعہ کا موقعہ ملا۔ اس کے بعد اُس نے وہ زندۂ جاوید نظم "ودروہی" (باغی) لکھی جس نے اُسے ادبی انقلاب کا علم بردار بنایا اور "ودروہی کوی" (شاعر بغاوت) کا لقب دلایا۔ پروفیسر بنے کمار سرکار اپنی تصنیف (Futurism of Asia) میں اس نظم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "جب میں نے نذرالاسلام کی نظم "باغی" کو پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ گزشتہ دس سال سے ہم بنگلہ ادب میں جس انقلاب کے متوقع تھے آج اُس کا آغاز ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہی کہ ہمارے ادب میں زندگی اور جوش کا ایک دریا اُمنڈ پڑا ہی۔ مسلمانوں نے اب تک اپنی مادری زبان کی خدمت اتنی نہیں کی تھی جتنی ان پر عائد ہوتی ہی۔ لیکن اب ثابت ہوا کہ بنگال کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کرنے کا سہرا شاید ان ہی کے سر بندھنے والا تھا۔"

بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہی کہ "باغی" ہمارے ادب میں اپنی قسم کی اچھوتی چیز ہی۔ وکٹر ہیوگو (طوفان) سون برن (ہرتھا) اور لارڈ بائرن (تخریب) جیسے باکمال شاعروں نے اس موضوع پر سیر حاصل نظمیں لکھی ہیں اور لنینکن کا ترانہ "آزادی" روسی انقلابیوں کے وردِ زبان رہ چکا ہی۔ لیکن باغی کی رفعت اور عظمت ان سب سے بڑھ چڑھ کر ہی۔ اس میں بلا کا زور ہی اور اُس کی خوبی ان اضداد میں مضمر ہی جن کے بوقلموں خمیر سے شاعر نے یہ "آتشین بت" بنایا ہی۔ ابھی اُس کے خیالات میں وہ پختگی اور صفائی تو نہیں آئی ہی اور نہ اُس کا نظریۂ زندگی اتنا واضح نہیں ہی جس کی نظیر "نعرۂ انقلاب"

کی نظموں میں ملے گی۔ مگر بغاوت کا ایسا رنگا رنگ اور مکمل خاکہ مشکل سے کہیں ملے گا۔

"آگمنی" (آمد) اور "ودروہی" (باغی) ان دونوں نظموں نے بنگال کے ادبی حلقوں میں ہل چل مچادی۔ اخباروں میں مہینوں اُن کا چرچا رہا اور قدامت پسندوں نے ان پر سخت واویلا مچایا۔ ان کی نئی بحریں اور نئے مضامین ایک نئے دور کا اعلان کر رہے تھے ٹیگور اسکول کے حامیوں کو یاد نہ رہا کہ کبھی اُنھوں نے بھی بنکم چیٹرجی اور ڈی۔ ایل۔ رائے کی روایات کو توڑ کر اپنے لیے راستہ بنایا تھا۔ ان ادبی مباحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوان اور بوڑھے دو حلقوں میں بٹ گئے اور اُن کے تنازعہ کی بنا نذرالاسلام کی شاعری قرار پائی۔

بنگلہ ادب کو نذرالاسلام کا عطیہ بڑا بیش قیمت تھا۔ سب سے بڑی چیز تو وہ سندیس تھا جو وہ اپنے وطن کے نام لایا تھا۔ یہ اُن جانبازوں کا پیغام تھا جو انسانیت کی نجات کے لیے دیس پردیس میں سولیوں پر چڑھ رہے تھے اور کال کوٹھریوں میں سڑ رہے تھے۔ لیکن وہ اسلوب کم اہم نہ تھا جس میں اُس نے اس پیام کو پیش کیا شاعری یا ادب کے ہر شعبے میں طرز یا اسلوب کو سب سے بڑا مرتبہ حاصل ہے اور اچھے سے اچھا مضمون اسلوب کے نقص کی وجہ سے بے اثر اور بے جان رہ جاتا ہے۔ نذرالاسلام اس راز کو سمجھا اور اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اُس نے جو لباس وضع کیا اُس کی سج دھج ہی نرالی تھی۔

بنگلہ زبان کی نسوانی غنائیت کسی رزمیہ مضمون کے لیے زہر ہلاہل تھی۔ اور ٹیگور کے بنائے ہوئے سانچے امن و آشتی کی ٹھنڈک

میں تو خوب کام دیتے تھے۔ لیکن عمل اور حرکت کی آنچ پڑتے ہی تڑخ جاتے تھے۔ یہاں فارسی کا وہ علم نذرالاسلام کے آڑے آیا جو اُس نے مکتبوں میں حاصل کیا تھا اور جس کی مشق اُس نے بعد میں بھی جاری رکھی تھی۔ وہ اُردو بھی کام آئی جو اُس نے کلکتہ کے بازاروں اور لڑائی کے میدانوں میں سیکھی تھی۔ اُس نے فارسی اور اُردو کے ٹھیک الفاظ اپنی نظموں میں گھلانے شروع کیے تاکہ بیان میں خاطرخواہ زور پیدا ہو سکے۔ ادبی پاکبازوں (Purists) کے لیے یہ بہت بڑی بدعت تھی۔ گو کہ بنگلہ بولنے والوں کی زیادہ تعداد مسلمانوں پر مشتمل تھی اور وہ عربی اور فارسی سے استفادہ کرنے کے اُتنے ہی مجاز تھے جتنا کہ ہندو سنسکرت سے، مگر جب نذرالاسلام نے ادبی ضروریات کی وجہ سے یہ جِدّت شروع کی تو اُسے فرقہ پرستی کا نام دیا گیا۔ بہر حال رفتہ رفتہ یہ رجحان بہت مقبول ہوگیا۔ اور اب تو اُس کے تتبّع میں غزل نویسی بنگلہ شاعری کی خاص صنف بن گئی ہے۔

نذرالاسلام کی دوسری دین وہ رزمیہ موسیقی تھی جو اُس کے پیام کو پُر اثر بنانے کے لیے ضروری تھی۔ یہاں موسیقی کے اُس علم نے اُس کی مدد کی جو اُس نے لڑکپن میں حاصل کیا تھا۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ ہندستانی شاعری کے قالب کو بدلنے والے سب لوگ موسیقی کے ماہر ہیں۔ بنگلہ میں ٹیگور اور نذرالاسلام اور ہندی میں "پنت" اور نرالا اس کی مثالیں ہیں۔ اُردو میں اب تک یہ تغیّر نہ ہو سکنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ اُردو داں تعلیم یافتہ طبقے

میں موسیقی کا چرچا نسبتاً کم ہے۔ علاوہ بریں اُردو بحروں کو وسعت دینے کے لیے ہندستانی موسیقی کو جاننے کی اُتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ عربی و فارسی موسیقی کو۔ اور یہ ٹیڑھی کھیر ہے۔

پیغام کی نوعیت، زبان و بیان کی جدّت اور طرزِ کلام کی قوت ــــ یہ وہ خوبیاں تھیں جنھوں نے بہت کم عمری میں نذرالاسلام کو بنگال کا سب سے مقبول شاعر بنا دیا۔

اس قسم کی نظموں کی اشاعت کا یہ ناگزیر نتیجہ تھا کہ ہمارے شاعر سے حولداری کی وردی چھن جائے اور اُس کی چھوٹی سی پنشن بند ہو جائے۔ یہی نہیں بلکہ حکومت نے اُس کی نظموں کے مجموعے بھی ضبط کرنے شروع کیے۔ چنانچہ اب تک وہ دو مرتبہ جیل کی ہوا کھا چکا ہے اور اُس کے پانچ مجموعے ضبط ہیں۔ ہندستان کے کسی دوسرے شاعر کو یہ فخر حاصل نہیں۔

لیکن حکومت کا عتاب اور قدامت پرستوں کی مخالفت اُس کا کیا بگاڑ سکتی تھی جسے قبولِ عام کی سند مل چکی ہو۔ اس نے ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان "کلّول" اور "نوروز" کے نام سے دو ہفتہ وار اخبار نکالے۔ شروع میں تو یہ خوب چلے لیکن جب سیاسی ہنگاموں کی جگہ ہندو مسلم فسادوں نے لے لی تو انھیں کون پوچھتا۔ بند ہو جانے کے بعد بھی کلّول کا اثر باقی رہا اور "کلّول اسکول" کے ادیب یورپ کے رومانی ادیبوں کی طرح اپنے لیے ایک خاص مقام بنا گئے۔ ان کی جدّتوں اور بدعتوں نے پنڈتوں اور مولویوں کے حجروں کو ماتم کدہ بنا دیا۔ ان ادیبوں میں سے کچھ نے نذرالاسلام کی سرکردگی میں سماجی

انقلاب کو اپنا اصلی مقصد بنایا۔ مگر کچھ اس راستے سے ہٹ گئے اور "جیمس جوئس" اور فرائڈ سے متاثر ہوکر انھوں نے جنسی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ اس کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ معلوم۔

یہ نذرالاسلام کی خوش نصیبی تھی کہ ٹیگور اسکول کی مخالفت کے مقابلے میں اسے سی۔ آر۔ داس جیسے قدر شناس کی پشت پناہی مل گئی۔ داس مرحوم بڑے وسیع القلب تھے اور ہونہار نوجوانوں پر اُن کا خاص التفات رہتا تھا۔ خود شعر کہتے تھے اور اُن کے کلام کا ایک مجموعہ موجود ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی نے ان کٹھن منزلوں میں نذرالاسلام کی رہبری کی جن کی کھکھیڑیں ہر باکمال کو ابتدا میں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ وہ اُس کے ایسے شیدا تھے کہ اپنے انگریزی روز نامہ "فارورڈ" (Forward) کے سر ورق پر اس کی بنگالی نظمیں چھاپا کرتے تھے۔

۱۹۲۶ء کا سال نذرالاسلام کے لیے بڑا منحوس ثابت ہوا۔ اس سے پہلے اُس کے مشفق سی۔ آر۔ داس کا انتقال ہوچکا تھا۔ ادھر ہندو مسلمانوں میں ہر طرف جنگ چھڑی ہوئی تھی اور ہر روادار انسان فریقین میں نکّو بنا ہوا تھا۔ اس پر طرفہ یہ کہ اس نے انھیں دنوں ایک ہندو لڑکی سے شادی کرلی۔ اس کے بعد تو فرقہ پرست اس کی جان کے لاگو ہو گئے۔ اور ہر طرف سے اس پر اعتراضات کا ڈونگرا برس پڑا۔ حکومت کا ظلم، مولویوں کا غیظ و غضب اور اب ہندو جماعت کا ستم ــــ اپنی ایک نظم میں وہ اس مرحلے کا ذکر کرتا ہے:-

"میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں۔

کوئی کہتا ہے کہ اگلے زمانے میں تجھے کون یاد کرے گا۔

کوئی کہتا ہے شاعر کو قید و بند سے کیا واسطہ۔
کوئی کہتا ہے دوبارہ جیل جاکر وہیں خوب لکھ سکتا ہے۔
مولوی میرے چہرے پر اسلام کی علامت (ڈاڑھی) نہ پاکر
مایوسی سے اپنی ڈاڑھی کھجانے لگتا ہے۔
ہندو کہتے ہیں کہ اس نے ہندو لڑکی سے شادی کرلی ہے،
لہذا یقیناً فرقہ پرست ہے۔
گاندھی جی مجھ پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں۔
عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمنِ نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست
بتلاتے ہیں۔
غرض کہ میری جان ضیق میں ہے۔
لوگو مجھے اس کی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں۔
تمنّا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلقِ خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں،
میری خونچکاں تحریر ان کے لیے پیامِ موت ثابت ہو۔"

اس وقت نذرالاسلام یہ آندھی بھی سہ گیا۔ اس زمانے کی زندگی کا نقشہ اُس نے افلاس میں کھینچا ہے۔ وہ اُسی لگن کے ساتھ اپنا کام کرتا گیا۔ یہ ہمارے ادب کی کم نصیبی کہ روٹیوں کے لیے اسے وہ گیت لکھنے پڑے جو اب بنگال کے بچّے بچّے کی زبان پر ہیں۔ اس ادبی کاوش میں لامحالہ شاعری سے زیادہ موسیقی کو دخل تھا۔ اور یہ شاعر کا نہیں 'نغمہ ساز' کا کام تھا۔ آہستہ آہستہ یہ رنگ زور پکڑتا گیا۔ اور اب اس کی شاعری پر یکسر غالب ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی انقلابی شاعری ۱۹۲۰ء میں شروع ہوکر ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ سرد ہوگئی۔

اس قسم کی جدّ و جہد اپنے ماحول سے زیادہ عرصے تک الگ نہیں رہ سکتی۔ چرخہ اور کھادی کے ساتھ انقلاب کے گیت نہیں گائے جاتے۔

نذرالاسلام کی شاعری تین ارتقائی منزلوں سے گزری ہی۔ ابتدائی دور جو بہت مختصر اور کم اہم تھا اس اسلامی اثر کا شاہد ہی جو تحریک خلافت کے دنوں میں ہر مسلمان پر چھایا ہوا تھا اس زمانے میں اس نے جو نظمیں لکھیں ان میں انور پاشا اور مصطفیٰ کمال پر دو چھوٹے چھوٹے رزمیہ منظوم مکالمے تھے۔ ان کا سارا لطف حسنِ بیان میں مضمر ہی جس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ معرکۂ کربلا وغیرہ پر بھی چند نظمیں ہیں۔

دوسرا دوْر جو سب سے طویل اور اہم ہی "باغی" کی اشاعت کے ساتھ شروع ہوتا ہی۔ اس دوْر کی نظموں کا انتخاب ہم نے "مجاہد کی صدا" کے عنوان سے کیا ہی۔ یہ جوش اور اُمنگ کا زمانہ تھا اور اس پر اس ماحول کا اثر تھا جس نے بنگال کے بہت سے نوجوانوں کو بم بازی اور دار و رسن کی طرف کھینچا تھا۔

تیسرا دوْر جو ۲۶ء کے لگ بھگ شروع ہوا، سب سے زیادہ اہم ہی۔ اس اعتبار سے کہ اس زمانے میں اسے غور و خوض کا موقع ملا اور وہ اشتراکیت کے خد و خال کو جانچ پرکھ سکا۔ اسے وہ فلسفۂ زندگی اب جاکر ملا جس کی تلاش میں وہ برسوں سے بھٹک رہا تھا۔ "نعرۂ انقلاب" کے تحت کی نظمیں بتلائیں گی کہ اُس نے اپنے موضوع کا مطالعہ کیا ہی۔ اور اس ضمن میں ایسے ایسے نازک نکتے بیان کر گیا ہی

جو نظر بینی کے طالب ہیں۔

مگر اِس ساری مدّت میں اس تناور درخت سے وہ امر بیل لپٹی ہوئی تھی جو کسی فن کار کو بے داغ نہیں چھوڑتی۔ اس کا نام "رومان پسندی" یا "بہیمیت" ہے۔ بنگال کی سرزمین اس بیل کی نشو و نما کے لیے موزوں ہے بھی۔ وہاں کے اودے اودے بادلوں، گھنیرے پیڑوں اور ڈبڈبائی ہوئی ندیوں کے پیچھے رومان مسکراتا ہے۔ نذرالاسلام پر بھی یہ جادو چل ہی گیا۔ اس کا ہلکا سا پرتو اُن تینوں نظموں میں ملے گا جو "یاد ایّام" کے نام سے اس مجموعے میں شامل کی گئی ہیں۔ لیکن سچ پوچھا جائے تو اس رُجحان کا اثر بہت دُور رس تھا۔

ابھی ہم نذرالاسلام کے قریب اور اُس منزل سے دور ہیں جس کی چھب دکھانے وہ آیا تھا۔ جب ہم اپنے تمدّنی ورثہ کو تنقید کی آگ پر پرکھیں گے تو وہ ہمیں ادبِ جدید کے پیغمبر کی صورت میں نظر آئے گا۔ یہ اس لیے کہ ہماری شاعری میں وہ پہلا شاعر ہے جس نے ہمارے اقدار کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس لحاظ سے کہ زندگی کی رَو پیچھے کی طرف نہیں بلکہ آگے کی طرف بڑھے جب وہ بار بار جوانی اور پیری کے تنازعہ کا ذکر کرتا ہے تو اس کا مدعا وہ نئی تہذیب ہے جو پُرانے کھنڈروں کو توڑ کر اپنا گھر بنا رہی ہے۔ یہ وہ سرمایہ دارانہ "مغربی" تہذیب نہیں ہے جو آقا اور غلام کے پُرانے رشتے کو مالک اور مزدور کے نئے ناتے میں گوندھتی ہے بلکہ وہ نئی تہذیب جو قوم و مذہب، رنگ و نسل کی سرحدوں کو توڑ کر دنیا کو مساوات اور آزادی کا درس دیتی ہے۔ اس مہم کی

فتح یابی کا ترانہ شاعر یوں گاتا ہی:-

"وہ مبارک ساعت آپہنچی۔

ہتوڑی اور کُدالی سے جو پہاڑوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہی،

راستے کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں،

تمھاری خدمت کے لیے جس نے قلی اور مزدور کا روپ لیا ہی،

تمھارا بارِ گناہ اُٹھانے کے لیے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہی،

وہی -- صرف وہی مزدور مکمل انسان ہی۔ میں اُسی کے گیت گاتا ہوں۔ اس کا ٹوٹا ہؤا دل ایک نئی دنیا کی تعمیر کرے گا۔ ××××

آج مظلوموں اور بے کسوں کے خون سے رنگ کر بطن گیتی سے

آفتاب تازہ پیدا ہؤا ہی۔ ××××

آج دنیا کے بندھن کٹ رہے ہیں اور ایک عظیم الشان دورِ بیداری کا آغاز ہو رہا ہی جسے دیکھ کر خدا مُسکراتا ہی اور شیطان خوف سے لرزتا ہی۔"

نذرالاسلام کا نظریہ یہ ہی کہ زندگی دایم و قایم ہی اور انسان لاشریک لہٗ اس کا کارساز ہی۔ وہ شباب کا ہم دوش اور انقلاب کا نقیب ہی۔ وہ تغیر کا حامی اور جمود کا دشمن ہی۔ وہ قدامت کا حریف اور جدید کا علم بردار ہی۔ وہ قدرت اور سماج کے مظالم کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہی اور شاعری کو اس مہم میں جنگ کی دیوی بنا دیتا ہی۔ اس کے نزدیک انسان سب سے افضل اور اکمل ہی۔

ہندُستان کی شاعری میں یہ ایک نیا خیال ہی۔ اب تک ہم زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بے چارگی کا نوحہ سُنتے آئے تھے

اور ہمارا ایمان راسخ تھا کہ حقیقت صرف موت کے بعد مل سکتی ہے۔ صرف ایک مرتبہ کبیرداس نے دبی زبان میں کہا تھا کہ جو چیز زندگی میں نہیں مل سکتی وہ موت میں کیوں کر مل سکتی ہے۔ لیکن ہم نے اُس کے ماننے والوں کو چارہ بناکر چھوڑدیا۔ اور پھر قضا وفنا کی حمد گانے لگے۔ اب پہلی بار ایک شاعر نے اس ذہنی غلامی کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور ادبی انقلاب کی ایسی طرح ڈالی کہ اِس کی لیک پر آج ہر طرف آتش کدے روشن ہورہے ہیں۔

نذرالاسلام نے دوئی کا پردہ اُٹھانے کی لاحاصل کوشش کبھی نہ کی۔ اس معاملے میں اُس نے گوتم بدھ کے اس صائب مشورے پر عمل کیا کہ جو اس جھیلے میں پھنسا وہ پاگل ہوکر رہے گا۔ اس نے صرف دنیوی زندگی اور اُس کے مسائل کو سمجھنے سمجھانے میں اپنا صلاحیت صرف کی۔ اس سے بڑی عبادت اور کیا ہوسکتی ہے؟۔ زندگی کی تلخیوں سے منہ چرانا بہت آسان ہے اور صوفیوں کی قبا بہت سستے داموں بازار میں مل جاتی ہے۔ لیکن مجاہد کا خونی کفن ہر کسی کے نصیب میں نہیں ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

زندگی کی ہر وادی میں چل پھر کر اُس نے یہی دیکھا کہ دنیا دو چھاونیوں میں بٹتی ہوئی ہے۔ ایک طرف انسانوں کی اکثریت جہالت اور افلاس میں گھٹ رہی ہے۔ اور دوسری طرف اُس کی محنت کا پھل تھوڑے سے تن آسان ہڑپ کر رہے ہیں۔ چند

سرفروش ہر دور میں اس ظلم پرور نظام کو بدلنے کے لیے لڑتے ہیں نذرالاسلام صرف انھیں کا ثناخواں ہے۔ "باغی" اسی مجاہد کا ترانہ ہے اور اتنا عظیم الشان ترانہ کہ اسے سُن کر ہم مبہوت سے رہ جاتے ہیں دیر تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف تاریکی ہے اور بادلوں میں ایک بجلی تڑپ رہی ہے۔

یہ مجاہد ظلم اور بے انصافی کے نظاروں کو دیکھ دیکھ کر انتقام کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت کا نقشہ روسی ناول نگار "ترجنیف" نے اپنے شاہکار (Fathers and Children) میں کھینچا ہے۔ جب اُس کا ہیرو مرتا ہے تو ایک نقّاد کہتا ہے، "وہ بربادی جو برباد کرتے کرتے خود برباد ہوگئی"۔ کیا نذرالاسلام کا ہیرو بھی تخریب و تباہی کے سوا کچھ نہیں چاہتا؟ — "ستارۂ تخریب" فضا میں ہول اور ہراس کے سوا کچھ باقی نہیں چھوڑتا معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز مرگئی، مٹ گئی، مُرجھا گئی —

لیکن یہ ایک عارضی کیفیت ہے۔ مستقبل جذبہ اُس تعمیر کا ہے جس کا خواب ہم "نعرۂ انقلاب" کے آخری بندوں میں دیکھتے ہیں۔ رہ رہ کر اُمید کی یہ کرن شاعر کے اندھیرے ماحول کو اُجالتی ہے اور شک و شبہ کے اُس منجدھار سے نکالتی ہے جسے ہم "ناخدا" میں پاتے ہیں —

دہشت پسندی اور اشتراکیت کے بیچ میں جو دورِ تغیر ہے اس سے انقلاب پرور دیر میں گزرتا ہے اور اُس کے لیے بڑے ضبط اور

توازن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان کی انقلابی تحریک اس پُرخارہ راہ سے کس طرح گزری اس کا مُرقع ہمیں ان نظموں میں ملے گا۔ وہ "باغی" جو سر ہتیلی پر لے کر نکلا تھا بیچ میں مجروح ہو کر۔ تھک کر نہیں۔ گر پڑا:

"صبح تک وہ مُسافر ساحل کو نہ پہنچا جس نے اُس اندھیری
رات کو تلاطم خیز دریا میں اپنی ناؤ ڈال دی تھی"

اب شاعر اپنی منزل سے بھٹکنے لگتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اشتراکیت کی چند کتابیں الماریوں میں رکھی ہیں اور کچھ آرام طلب دیوانخانوں میں انقلاب زندہ باد کے نعرے بھی لگا رہے ہیں۔ لیکن نظریہ اور عمل کے درمیان ایک حدّ فاصل ہے جس کے طے ہونے میں ابھی دیر ہے۔ تو شاعر بھی تھک کر راستے میں بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن شراب و شباب کی مصیبت میں گرفتار ہو کر بھی وہ اپنے مقصد کو نہیں بھولتا "یاد ایّام" میں اس ردّ عمل کا ذکر یوں کرتا ہے:

"معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا۔
کیوں نہ اب میں موت در آغوش طوفان کا ہم سفر
بن جاؤں؟۔ راستے میں کس کی یاد میں فریاد کرتا پھروں؟
کیوں نہ آتش فشاں پہاڑ اپنے غارتگر دہانے کھول دیں؟
کیوں نہ میری گرم گفتاری بغاوت کے جھنڈے لہرا دے
اور موت کے گیت میرے ہم سخن ہو جائیں"

دو مرتبہ جیل جانے اور کلام کے کئی مجموعے ضبط ہو جانے کے بعد بھی اُس کے استقلال میں فرق نہیں آتا:۔

"اے خالقِ جدید! تیرے اشارے پر میں کس عزم واستقلال سے اسی راہ پر چلتا رہا ہوں۔ جب تو نے مجھے پکارا تجھے یہی جواب ملا کہ ہاں ہاں میں ثابت قدم ہوں۔"

تھوڑے عرصے سے وہ پھر بجھا سا ہے اور وہ گیت ہم نے نہیں سنے جنہوں نے شباب کے خون کو گرمایا اور اس کے دل کو دھڑکایا تھا۔ لیکن یہ ایک وقفہ ہے اور عجب نہیں کہ جب "آزادی کے سپاہی" وزارتوں کی گدیوں کو خالی کر کے اپنے اصلی مورچوں پر لوٹ جائیں تو بنگال کا باغی شاعر ایک مرتبہ پھر جاگ جائے اور اپنے روح پرور نغموں سے ملک کو تھرّا دے۔

کئی سال پہلے جب ہم نے رسالۂ اردو کے لیے نذرالاسلام کی بعض نظموں کے ترجمے کیے تو اس کے ایڈیٹر نے اپنے نوٹ میں لکھا تھا: "ہندوستان کی کسی زبان میں اس قیامت خیز قوت کا کوئی شاعر نہیں پایا جاتا۔ اس کے کلام میں ایک آگ بھری ہوئی ہے جس کے سامنے عامیانہ خیالات اور ہماری شاعری کے مضامین گھاس پھوس معلوم ہوتے ہیں۔"

در اصل اس کی شاعری کا کمال اس کی قوت میں مضمر ہے۔ ترجمہ اس کے بیان اور تخیّل کا تو ہو سکتا ہے لیکن اس کی موسیقی کا زور ترجمے کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ یہ موسیقی کبھی طوفان خیز لہروں کی طرح دھاڑتی اور کبھی لو کے آتشیں جھونکوں کی طرح سنسناتی ہے کبھی وہ آسمان بوس پہاڑوں کی طرح اپنی شوکت سے آپ مبہوت

ہو جاتی ہے۔ مثلاً "آگمنی" (آمد) نامی نظم کو لیجیے۔ اس میں میدانِ جنگ کا نقشہ ایک نئے انداز سے کھینچا گیا ہے۔ گرمیٔ بیان کا یہ حال ہے کہ میدان کے شور و شغب کا ہنگامہ کانوں تک پہنچتا ہے۔ زور الفاظ کا اس سے بہتر نمونہ پیش کرنا دشوار ہے۔ گو کہ رسم الخط بنگلہ تلفظ کو تحریر میں لانے سے قاصر ہے۔ پھر بھی ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے

اے کی رن باجا باجے گھن گھن

جھن رن رن رن جھن جھن جھن!

لپکی دکی دکی، دھمکی دھمکی

واما دریمی گمکی گمکی

اوٹھے چھوٹے پھوٹے

چھوٹے لوٹے پھوٹے!

بہنی پھنکی چمکی چمکی

ڈھال تلوارے گھن گھن!!

اے کی رن باجا باجے گھن گھن

رن جھن جھن۔ رن جھن جھن!

ہندستانی زبانوں میں آلہا اودل کے رزم نامہ کے علاوہ شکوہِ الفاظ کا یہ نمونہ اور کہیں نہیں ملے گا۔

دوسرا بڑا کمال یہ ہے کہ اُس کی قوت بے حسن نہیں ہے۔ اُردو زبان میں ادھر بہتیری انقلابی نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔ ان میں خالی خولی جوش کی اتنی بھرمار ہے کہ بادِ سموم کا سارا زور ختم ہو جاتا ہے، ہمارے حصے میں صرف دھول اور ریت رہ جاتی ہے۔ رزمیہ موسیقی

کے بدلے وہ آوازیں سُنائی دیتی ہیں جو پہلوان ڈنڈ پیلتے وقت نکالتے ہیں۔

تعجّب ہوتا ہے کہ ان انقلابی مضامین کو نذرالاسلام نے ادب پارے کیسے بنادیا؟۔ تخیّل کی یہ پرواز کیسے باقی رہی؟۔ تصور کی یہ رنگینی پھیکی کیوں نہ ہوئی؟ یہ آگ جلتے جلتے بھی اپنی شعاعوں میں ہمواری کیسے باقی رکھتی ہے؟۔ یہ طوفان گرجتے گرجتے بھی اپنے تال سم کو بگڑنے کیوں نہیں دیتا؟۔ "باغی" سے زیادہ زور دار اور ساتھ ہی ساتھ خوبصورت نظم کہاں ملے گی؟ یہ باغی یونان کا رستم ہرکلس نہیں جس کی ٹانگیں آہنی ستونوں سے زیادہ موٹی تھیں۔ بلکہ "ہومر" کا تشکیل وجمیل ہیرو ایکیلس ہے جس کی تلوار میں اتنی ہی کاٹ تھی جتنی کہ اُس کے مد بھرے نینوں میں۔

جب ہم اُس کے کلام کو پڑھتے ہیں تو اُس کے خیالات سے اتفاق کریں یا نہ کریں اُس کی تحریک کی تائید کریں یا نہ کریں لیکن اُس کے خلوص کا سکّہ ہمارے دل پر بیٹھ جاتا ہے اور اُس کی سرفروشی کے آگے ہمارا سر ادب سے جُھک جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی وہ اپنی راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ لیکن اس راہ روی میں لطف ہی کیا اور ایسے ہم سفر کا ساتھ ہی کیا جس نے کبھی ٹھوکر نہیں کھائی اور کبھی راہ نہ بھولا اس وقت ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ یہ راستہ کتنا دشوار ہے اور اس پر چلنے والے کتنے گنے چُنے لوگ ہیں۔ ان میں سے کوئی اگر تھک کر دم بھر کے لیے بیٹھ جائے یا کوئی گھائل ہوکر گر پڑے تو وہ ہماری ہمدردی کا مستحق ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ نذرالاسلام ظلم اور ظالم کا دشمن ہے۔ اور وہ ہر انسان و خیال کو اسی کسوٹی پر کستا ہے۔ اگر کذب و افترا کی تنقید میں وہ کبھی درشتی سے کام لیتا ہے تو اُس کے معنے یہ نہیں کہ اس کا واحد مقصد کسی عقیدے کی ہتک ہے۔ میدانِ جنگ میں فصیل پر بیٹھنے والوں کو ہوشیار رہنا ہی پڑے گا۔ اِدھر اُدھر سے ایک آدھ نشانہ اُنھیں آہی لگے گا۔ ایسے موقع پر تماش بین کو اس خود فریبی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ میدان کا مرد وہی ہے اور سارے نشانے اُسی پر لگائے جارہے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ ایشیا نے جو جمہوریت کی نعمتوں سے ہمیشہ محروم رہا، اگر کبھی تحریر کی آزادی دی تو صرف اپنے شاعر کو۔ کوئی وجہ نہیں کہ اگر شاعر شراب چھیننے والے خدا پر چشمک زنی کرے تو ہم ہنس کر ٹال دیں اور اگر روٹی چھیننے والے خدا پر چیں بجبیں ہو تو ہم اس غریب پر جریبیں تاننے لگیں۔

ہم نے دیکھا کہ جب ہمارے ملک کی ترقی پسند تحریک قومیت سے بڑھ کر اشتراکیت کی راہ ڈھونڈ رہی تھی تو ادب میں اس رجحان کی علم برداری نذرالاسلام نے کی۔ اسی طرح ادب کے قالب میں اُس نے یہ تبدیلی کی کہ ٹیگور کی ابہام پسندی کو چھوڑ کر مضمون کی خارجیت اور اسلوب کے حسن کا وہ امتزاج کیا جسے رومانی حقیقت پسندی کہتے ہیں اور جو گورکی مرحوم کا خاص وصف تھا۔

اگر ہم یہ مان لیں کہ ٹیگور نے دانستہ کسی فلسفۂ زندگی کی تلقین نہیں کی تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہند جدید کے دو سب سے

بڑے مفکّر شاعر- اقبال اور نذرالاسلام مسلمان تھے۔گو وہ دو متضاد رجحانوں کے پیشوا تھے لیکن انھیں وہ بے چینی متحرک کر رہی تھی جو مسلمانوں کے جمود کو دیکھ کر ہر ذی حس میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ دونوں رجحان دو مختلف سمتوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ ایک پیچھے کی طرف بلاتا تھا اور دوسرا آگے کی طرف بڑھاتا تھا۔ لیکن دونوں حرکت اور عمل کی دعوت دیتے تھے اور سرمایہ داری و سامراج کے دشمن تھے۔ ہندستانی شاعری کو ان دونوں کی ایک بڑی دین یہ بھی تھی کہ اس میں انھوں نے زندگی کے مقاصد کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔

اس مجموعے کی تکمیل کے وقت ہمیں یاد آتا ہے کہ اس کی چند نظمیں ایک موقع پر ہم نے اقبال مرحوم کو دکھائیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور ہم سے دیر تک نذرالاسلام کا ذکر کرتے رہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمائش کی کہ انھیں کتابی صورت میں شایع کیا جائے۔ افسوس کہ اقبال آج ہم میں نہیں ہیں۔ وہ نذرالاسلام کے خیالات کے سخت مخالف تھے لیکن اس کے شاعرانہ کمال کے بڑے معترف تھے۔ اس کاوش کی وہ یقیناً داد دیتے۔!

یہ کہا جا چکا ہے کہ نذرالاسلام کے انقلابی کلام کا بیشتر حصّہ ضبط ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے یہ کلام انمول ہے۔ اب جب کہ ہر طرف "رام راج" کی ہوا چل رہی ہے۔ اچھا ہو اگر ان پر سے تحدید ہٹالی جائے۔

فی الحال ہمارے تراجم کا دائرہ ان نظموں تک محدود ہے جو بازار میں بکتی ہیں۔ اُن کے انتخاب کی ذمہ داری ہم پر ہے۔

آج سے چھ سات سال پہلے جب ہم نے اُردو داں طبقے سے

اس شاعر کا تعارف کرایا تو لوگوں کی حیرت کی حد نہ رہی۔ یہ تراجم بڑے شوق سے پڑھے گئے اور ہم سے متعدد مرتبہ انھیں مجموعے کی صورت میں چھپوا دینے کی فرمائش کی گئی۔ خدا خدا کرکے وہ ساعت اب آئی۔ ان میں سے کئی نظموں کے تراجم غیر مطبوعہ ہیں۔

نذرالاسلام کا پیغام مذہب و ملت کی قیود سے آزاد ہے۔ ممکن ہے کہ اُس کے خواب کی تعبیر کبھی نظر آئے اور پھر اُس کے گیت پُرانے ہو جائیں۔ لیکن یہ باور کرنا مشکل ہے کہ دنیا میں مجاہدوں اور شہیدوں کی ضرورت یکسر نہ رہے گی۔ بفرض محال کبھی ایسا ہوا بھی تو نذرالاسلام سے زیادہ کسی کو خوشی نہ ہوگی۔ خود کہتا ہے "میں دورِ حاضر کا شاعر ہوں مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں۔ آنے والا زمانہ مجھے یاد کرے گا یا نہیں، اس کی مجھے پروا نہیں۔"

وہ اپنی نسل کی خدمت اس لیے کرسکا کہ اُس نے ابد کی ڈائری میں اپنا نام ٹانکنے کی کوشش نہیں کی۔

اختر حسین رائے پوری

لندن ۱۰۔ نومبر ۱۹۳۵ء

پہلا دور

مُجاہد کی صدا

مجاہد کی صدا

پُر آشوب گھٹائیں، تاریک راتیں اور ہولناک آندھیاں شاہد ہیں
کہ اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو میں نے لہروں کے سپرد کر دیا ہے۔
میرے نقشِ قدم کو دیکھنے کے لیے کالے بادلوں میں بجلیاں
مچلتی ہیں۔
اور میری پرچھائیں کے نیچے اُجڑے ہوئے راستوں میں نو بہار
کونپلیں اُگنے لگتی ہیں۔
میرے نوحوں کو سُن کر گورِ غریباں کے چراغ پھر سے زندگی
کا سانس لیتے ہیں۔
اور میں چقماق کی طرح ہر گھر میں آگ جلاتا جاتا ہوں۔
نئی زندگی فرات کے دھارے کی طرح بہہ رہی ہے
لیکن اس کا ساحل قربانی کا پیاسا ہے۔
ظلم کے لشکر موج در موج چڑھے آتے ہیں۔
اور میں عباس کی طرح اس دریا کو اپنی تشنہ لبی کا پیغام
سُنانے جا رہا ہوں۔

جب کوئی فرعون کسی موسیٰ کو مٹانے نکلتا ہے
تو میں نیل کا سیلاب بن کر اُسے فنا کر دیتا ہوں۔
جب کوئی نمرود کسی ابراہیم کے نعرۂ حق کو مسوسنا چاہتا ہے۔
تو میں آتش کدہ کو گل کدہ بنا دیتا ہوں۔

پُرآشوب گھٹائیں، تاریک راتیں اور ہولناک آندھیاں شاہد ہیں
کہ اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو میں نے لہروں کے سُپرد کردیا ہے۔
اپنے سہمے ہوئے وطن کو میں جرأت کا درس دیتا ہوں۔
اور پیری میں سدا بہار جوانی کے ولولے پیدا کرتا ہوں۔
اور میری جاں بازی روشن میناروں سے طوفانوں کی آرتی
اُتارتی ہے۔
نئی زندگی کے مسافر اسی راہ سے گزریں گے۔
اِس آس پر میں اس پُرخار ڈگر پر اپنا سُکھ دُکھ، جان مال، سب
کچھ لُٹائے جاتا ہوں۔
جب مستقبل کی کوئی شام آزادی کا پرچم لہراتے ہوئے اس
طرف آئے
تو لوگو! ایک نظر آسمان کی طرف بھی دیکھ لینا۔
میں تمھیں ستاروں کی محفل میں مسکراتا ہؤا دکھائی پڑوں گا۔
پُرآشوب گھٹائیں، تاریک راتیں اور ہولناک آندھیاں شاہد
ہیں کہ اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو میں نے لہروں کے سپرد کردیا ہے۔

———— ⁘ ————

باغی

کہہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میں سر بلند ہوں۔
اتنا بلند، اتنا بلند، کہ ہمالیہ کی چوٹی بھی میرے آگے سرنگوں ہے
کہہ دے! اے بہادر کہہ دے کہ اس وسیع آسمان کو چیر کر چاند سورج
اور ستاروں کو توڑ کر، جنت و دوزخ کو دہلا کر اور عرش سے
ٹکرا کر
میں اس دنیا کے لیے مجسمۂ حیرت بن گیا ہوں۔
کہہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میرا سر ہمیشہ بلند رہے گا۔
میں سرکش، سنگ دل اور آتش زباں ہوں۔
میں قیامت کا ندیم ہوں۔ طوفان ہوں، تباہی ہوں، وحشت
ہوں۔ میں دنیا کے لیے سراپا ہلاکت ہوں۔
ہر چیز کو چکنا چور کر دیتا ہوں! لاابالی ہوں، اصول شکن ہوں۔
قانون، قاعدوں اور پابندیوں کو پاؤں کے نیچے روند ڈالتا
ہوں۔
میں بربادی کا دیوتا ہوں۔ موسم ہو یا نہ ہو موسلا دھار برکھا
برسا دیتا ہوں۔
کہہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میں ہمیشہ سر بلند رہوں گا۔
میں باغی ہوں! مادرِ گیتی کی سرکش اولاد!
میں ہوں بادِ سموم اور لو کا گرم جھونکا۔
میری راہ میں جو چیز حائل ہوتی ہے اُسے میں چور چور کر ڈالتا ہوں

میں وحشیوں کا رقص ہوں! اپنے تال پر میں آپ ہی ناچنے لگتا ہوں۔

سماج کی بندشوں سے آزاد ہو چکا ہوں۔
میں سپاہیوں کا گیت ہوں! میں آتش نوا موسیقی ہوں۔
میں سرابِ صحرا ہوں۔
چلتا ہوں اور ٹھٹکتا ہوں۔ سنبھلتا ہوں اور لڑکھڑاتا ہوں۔
ایک ایک قدم پر ہزاروں لغزشیں۔
میں مضطرب برقِ سوزاں ہوں۔
جو دل میں آتا ہی کرتا ہوں۔
دشمن سے تکرار کرتا ہوں اور موت سے نبرد آزمائی میرا کھیل ہی
مہلک مرض ہوں، وبا ہوں، ایک عالم گیر خطرہ ہوں!
حکومتوں کے لیے آفت کا کوہِ آتش فشاں!۔
غارت گر ہوں ــــ تند خو ہمیشہ بے قرار!
کہہ دے! ای جواں مرد کہہ دے کہ میں سر بلند ہوں۔
میں ہوں سرمستِ ازلی اور رندِ خانہ خراب جس کا کوئی طاقت کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔
میرا پیمانۂ زندگی ہمیشہ چھلکتا رہتا ہی۔ میں قربان گاہ کی آگ ہوں
میں خود ہی آتش ہوں اور خود ہی آتش پرست!
میں ہی تخلیق ہوں اور میں ہی تخریب!
میں شہرِ آباد ہوں اور شہرِ خموشاں!
لیلائے شب کا قاصد ہوں!

دیوتاؤں کی ملکہ کا نورِ نظر ہوں۔
میری مٹھی میں چاند ہے اور پیشانی پر سورج جگمگاتا ہے۔
ایک ہاتھ میں سریلی بانسری ہے اور دوسرے میں لڑائی کا بگل
میں وہ مہادیو ہوں جس نے سمندر کو کھنگال کر زہر ہلاہل نکالا
اور اُسے خود ہی پی لیا[1]۔
میں وہ مہادیو ہوں جس نے گنگا کو اپنی زلفوں میں قید
کر رکھا ہے۔
اپنی خودی کے علاوہ میں کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا۔
میں کوندے کی لپک اور بجلی کی چمک ہوں!
میں صورِ اسرافیل کی صدائے بازگشت ہوں۔
قیامت کے دیوتا کا پرچم اور جبرئیل کا عصا ہوں!
میں اُن پیغمبروں کا پجاری ہوں جن کی چین جبیں ایک عالم
کو تہ و بالا کر ڈالتی تھی۔
میں آتش کا پرکالہ ہوں! اس دنیا کو جلا کر خاک کردوں گا!
میں وہ قہقہہ ہوں جو روح سے نکلتا ہے۔
میں اس بوسیدہ سماج کا دشمن اور اس کے لیے خطرۂ عظیم ہوں
میں آفتاب کی تپش ہوں۔

---

[1] ہندو دیومالا کا ایک قصّہ کہ سب دیوتاؤں نے سمندر کو کھنگال کر اس میں سے چودہ جوہر نکالے جن میں آبِ حیات بھی تھا اور زہر بھی۔ امرت پینے والے تو سب تھے لیکن زہر کو کون چکھتا۔ آخر مہادیو جی نے یہ کڑوا گھونٹ گلے سے نیچے اُتارا۔

کبھی پُرامن ہوں تو کبھی قہر انگیز۔
میں وہ نوجوان ہوں جس کی رگوں میں تازہ خون بہتا ہے!
میں وہ ہوں جو دنیا کا غرور توڑ دیتا ہے۔
کہہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میں ہمالیہ سے بھی بلند ہوں۔
میں لو کی لپیٹ ہوں اور دریا کی پُرشور روانی۔
میں روشن ہوں آگ کی طرح!
میں بہتے ہوئے پانی کی آواز ہوں ـــ چنچل موجوں کی شیریں راگنی۔
کسی دوشیزہ کی زلفِ پریشان کا جوڑا ہوں، ترچھی آنکھوں کا تیر ہوں۔
کسی حسینہ کا اولین بوسہ ہوں، آفریں ہے مجھ پر!
کسی غم رسیدہ کا دلِ بیقرار ہوں! کسی بیوہ کے دل کی آہ ہوں۔ کسی ٹوٹے ہوئے دل کی پُکار ہوں۔
میں اُس مسافر کا غم ہوں جو ہمیشہ کے لیے مارا مارا پھر رہا ہو۔
کسی دِل جلے کی پُکار ہوں! زہر کی تلخی ہوں!
محبوب نے جس دل کو ٹھکرا دیا ہو اُس کی دھڑکن ہوں!
کسی مغرور اور غضبناک دل کی بے کسی ہوں۔

وہ درد ہوں جو دل پر چھا گیا ہو۔
پہلے بوسے کے بعد دوشیزہ کے جسم میں پیدا ہونے والی تھرتھری ہوں۔
کسی پردہ نشین معشوق کی سہمی ہوئی نگاہ ہوں جو شرارت

سے دیکھنے کے بعد بھی یوں آنکھ چُرا لیتی ہے گویا دیکھا ہی نہیں۔
کسی چنچل چت چور کا عشق ہوں اور اُس کی چوڑی کی میٹھی جھنکار!
میرا بچپن اور جوانی دائمی ہے۔
جو دیہاتی لڑکی جوانی کے بوجھ سے دبی جاتی ہے میں اُس کے دامن کا پچوڑ ہوں۔
کہہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میں ہمیشہ سربلند رہوں گا۔
میں بادِ زمہریر بھی ہوں اور بادِ سموم بھی۔
میں اُس شاعر کا متین ترانہ ہوں جو راہ طے کر رہا ہے اور بانسری پر گیت گاتا جاتا رہا ہے۔
میں ایک بے قرار اور پریشان دل ہوں۔
میں وہ سورج ہوں جو آگ برساتا ہے۔
ریگستانی آبشار کی روانی ہوں! دیوانہ وار بھاگا جا رہا ہوں۔
میں وہ وحشت ہوں! اور بے ہوش قلب کا ہوش ہوں۔
میں ترقی اور پستی کی انتہا ہوں!
اِس سرائے فانی پر میرا جھنڈا لہراتا ہے۔
اِنسان کی ظفرمندی کا میں نشان ہوں۔
جب طوفان کی طرح تالی بجاتے ہوئے جھپٹتا ہوں تو زمین و آسمان میرے ہمنوا ہو جاتے ہیں۔
دُنیا کی پیٹھ پر میں آگ کا پہاڑ ہوں، شعلۂ جانکاہ ہوں۔
کہہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میں سربلند ہوں۔

میں وہ جنگ کی دیوی ہوں جس کا سرتن سے جدا ہوگیا تھا۔
جہنم کی آگ میں نہاکر جب میں ہنستا ہوں تو میرے منہ سے
پھول جھڑنے لگتے ہیں۔
میں فانی ہوں! میں باقی ہوں! میں ازلی ہوں! میں ابدی ہوں!
میں وہ وحدت ہوں جو کثرت سے بالاتر ہے۔
میں انسان، شیطان، فرشتہ — سب کے لیے باعثِ خوف ہوں
دنیا میں مجھے آج تک شکست نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہوگی۔
میں خدا ہوں! میں حقیقی معنوں میں مکمل ترین انسان ہوں۔
بہشت، زمین اور تحت الثریٰ میں رقص کرتا پھرتا ہوں۔
میں دیوانگی ہوں، وحشت ہوں!
کہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میں ہمیشہ سربلند رہوں گا۔
میں نے خود کو پہچان لیا۔ میرے سب بندھن کھل گئے۔
میں پرشورام[1] کی سنگ دل کلھاڑی ہوں۔ دنیا کو خوں ریزیوں
سے پاک کردوں گا۔ یہاں میں ہی امن وامان قایم کروں گا۔
ایک نئی دنیا بساکر میں اس قدیم سیاہ کدہ کی اینٹ سے
اینٹ بجادوں گا۔
میں تحت الثریٰ کا مے نوش ہوں جہاں آگ شور و غوغا
مچاتی ہوئی دھاڑیں مارا کرتی ہے۔

---

[1] ہندو دیومالا کا ایک قصہ۔ پرشورام برہمن تھے اور کسی بات پر چھتریوں
سے برہم۔ اپنی کلھاڑی سے انھوں نے ۲۱ مرتبہ چھتریوں قتلِ عام کیا۔

میں بجلی پر بیٹھ کر کلیلیں کرتا ہؤا کبھی یہاں اور کبھی وہاں دوڑا پھرتا ہوں!

میں زلزلہ پیدا کرکے دنیا کو لرزہ بر اندام کردیتا ہوں!

کشن کی کلغی اور جبرئیل کے نورانی عصا کو میں نے چھین لیا ہے۔

میں دیوتاؤں کی اولاد ہوں۔

میں مضطرب ہوں۔ میں گستاخ ہوں۔ مادرِ عالم کا آنچل اپنے دانتوں سے تار تار کرڈالتا ہوں۔

میں شیام کے ہاتھوں کی بنسی ہوں۔ میری جادو بھری تان سے متوالا ہوکر سمندر گرج گرج کر آتا ہے اور سہمی ہوئی دنیا کو بوسہ دے کر سُلا دیتا ہے۔

جب میں بگڑ کر اُٹھتا ہوں تو آسمان کو ہلا دیتا ہوں دوزخ بھی تھر تھر کانپنے لگتی ہے۔

میں ساون کے مہینے کی ڈبڈبائی ہوئی ندّی ہوں۔ کبھی زمین کو شاداب بنادیتا ہوں تو کبھی برباد۔

شہابِ ثاقب ہوں، مریخ ہوں، دُم دار ستارہ، زہریلے ناگ کا من ہوں۔

کہہ دے! ای جواں مرد کہہ دے کہ میں ہمیشہ سربلند رہوں گا میں باغیوں کا سردار ہوں۔

خوں خواری سے میرا جی بھر گیا ہے۔

میں اُسی دن مطمئن ہوں گا جب مظلوموں کی فریاد فضائے آسمانی میں نہ گونجے گی۔

جب میدانِ جنگ میں تلوار اور خنجر کے خوفناک ترانے نہ سُنائی دیا کریں گے، وہ باغی جو جنگ و جدل سے نالاں ہے اسی روز خاموش ہوگا

میں وہ باغی "بھرگو" ہوں جس نے بھگوان کے دل پہ اپنا نقشِ قدم ثبت کر دیا تھا۔

جو خیالی قسمت سارے ظلم و ستم کی جڑ ہے، میں اس کی پوند بوند پی جاؤں گا۔

میں وہ باغی ہوں جو قسمت کے طلسم کو توڑ سکتا ہے۔

میں ہوں ازلی اور غیر فانی باغی۔

دُنیا کو ٹھکرا کر ایک بار پھر میں تن تنہا سر اُٹھا کر اُٹھ کھڑا ہوا ہوں

لے ہندو دیو مالا کا ایک قصہ۔ ایک مرتبہ وشنو بھگوان آرام فرما رہے تھے کہ ناگہاں برہما جی کا سرکش بیٹا "بھرگو" وارد ہوا۔ اور اُن کے سینے پر ایک ٹھوکر جڑ دی۔

طوفان آگیا!!

طوفان آگیا! طوفان آگیا!!

وہ دیکھو کڑکتی ہوئی بجلی اس کی آمد کا پیام دے رہی ہے۔

اُٹھ! اے بزدل، اب بھی اُٹھ، کہ اُس کی کڑک سے بند دروازے کے پرخچے پل بھر میں اُڑ جائیں گے۔

یہ دیکھو مغرب کی جھالر میں کالے کالے بادل طوفان کا پرچم لہرا رہے ہیں۔

اس کی ٹیڑھی چتون کے اشاروں پر ندّی نالوں کی موجیں پیچ و تاب کھا رہی ہیں۔

دیکھ اس کی تلوار کا وار کھا کر برقِ تپاں کس طرح تڑپتی ہے سنبھل جا ورنہ تیرے اوہام کی دنیا کو وہ ابھی ابھی درہم برہم کر دے گا۔

پھر خواہ نسیم شبنم کے آنسو ٹپکائے، خواہ گلبن میں پھول برسیں اور بادلوں کی آنکھیں اشک فشاں ہوں۔

مگر اُن کی آڑ سے روزِ حشر کی دُزدیدہ آنکھیں تاکنے لگیں گی۔

جس دیس میں سورج ڈوبا کرتا تھا، آج وہیں آفتابِ محشر جگمگا رہا ہے۔

مدّتوں تک اپنے خون اور پسینہ سے سینچ سینچ کر جس خاک کو

ہم نے کیمیا بنایا تھا، جس زمین میں ہم نے پھول کھلائے تھے، جہاں ہم نے پریت کے گیت گائے تھے۔

آہ! آج اُسی گلستاں پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔

آہ! آج اپنے گھر پر ہمارا کوئی بس نہیں۔

شام کے پھیکے پن میں جب شوق کے ترانے گاتے ہوئے بلبل اپنے آشیانے کی طرف لوٹا تو کیا دیکھا کہ کاندھے پر خون آشام ناوک لیے صیاد اُسے للچائی ہوئی نظروں سے تک رہا ہے۔

اب بےکس بلبل خرمن میں کس طرح جائے کہ اوپر شاہین پر تول رہا ہو اور نیچے ناوک فگن تاک لگائے ہوئے تھے۔

یہاں طوفان آگیا۔ طوفان آگیا یا قیامت کا پیغام آگیا۔

آج زندگی کی بازی لگاکر موت کے چنگل سے نکلنے کے لیے وہ تیار ہے؟

جو طوفان کے ساتھ نہ چلے گا وہ یقیناً آگ میں جل جائے گا۔

آگ میں جل یا دریا میں تیر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

جب موت کے ہاتھوں چھٹکارا ممکن نہیں تو اس سے خوشی خوشی گلے کیوں نہ ملیں۔

اس زندگی کو کبھی فنا نہیں۔ یہ بقائے دوام ہے۔

اگر زندوں کی طرح جینا ہے تو سر کے اوپر طوفان کا سایہ رہنے دے اور قدموں کے نیچے دریائے موت کو بہنے دے۔

یہ جسم رحمتِ باری کی دین ہے۔ کیا تو اس کی تحقیر کرتا ہے؟
کیا تو کتوں اور گیدڑوں کا کھاجا بننا چاہتا ہے؟
او ناداں! زندگی پھولوں کا ہار ہے موت کے گلے میں ڈالنے کے لیے!

میں اس وسیع دنیا کو اپنے قدموں تلے روندتا ہوں اور لاتعداد ستارے مجھے راہ دکھاتے ہیں۔

میری زیارت کو چاند اور ستارے باری باری سے آتے ہیں
نیلا آسمان میری بارگاہ کا شامیانہ ہے اور عندلیب میرے در پر نوبت بجاتا ہے۔ برسات میں بادل میرا غسل تیار کرتا ہے۔

اے بزدل! ان نعمتوں کا صلہ دینے سے تو کس طرح انکار کرسکتا ہے
ہم تو موت کے ہاتھوں بک کر قدرت کے اس قرض سے بیباق ہو جائیں گے
یہ جسم پاک اس لیے نہیں کہ امراض سے ہلاک ہو، ہم تو اسے قربان گاہ پر چڑھا دیں گے۔

یہ جسم کتنا حسین ہے، کس قدر خوبصورت!
ہم اسے کریہہ امراض کے سپرد کیوں کریں؟
جسم کے پھول کو زندگی کی آرتی میں رکھ کر موت کے دیوتا کی نذر کیوں نہ کریں؟
مہمان کو مرجھائے ہوئے پھول نہیں دیے جاتے۔
جا، زندگی کے پودے سے نوشگفتہ پھولوں کو توڑ لا۔

طوفان آگیا! اس مہمان کی تعظیم کر۔ اسے اپنے گھر میں جگہ دے

دوست کا گھر دیکھ کر یہ ہم دم بے بُلائے آگیا۔
اِس سے بغل گیر ہو۔

زندگی کے پیالے کو جوانی کی شراب سے بھر لے اور اسے پی کر بدمست ہو جا کہ تجھے طوفان کی ہم رکابی کرنا ہے۔
ناسمجھ! طوفان میں اتنا زور ہے کہ تیرا مکان چشم زدن میں بیٹھ جائے گا۔ دیوار کا سہارا لیے تو کیوں لرزہ براندام ہو رہا ہے۔
خاموش نہ بیٹھ۔ دروازے کو توڑ دے اور میدان میں آجا!

سورج ڈوب رہا ہے، اندھیرا چھا رہا ہے۔
لیکن اب بھی موقع ہے۔
جی چاہے تو اب بھی نکل آ۔
کہ طوفان آگیا!!!

ڈوبتا ہوا ملاح

یہ دلدل دُکھ درد کے پانی سے گھرا ہوا ہے۔

او پاگل! تو نے اپنا گھروندا یہاں کیوں بنا رکھا ہے؟

بے بادل کی بجلی کا اشارہ یہ ہے کہ اے محروم حیات! اپنی بساط بڑھا۔

دیکھ بادلوں کا پانی ماں کے آنسوؤں کی طرح سر پر ٹپک رہا ہے۔

اور دُور سے زمین درختوں کو اپنے بازوؤں کی طرح ہلا کر پاس بُلا رہی ہے۔

سرجوش سیلاب میں تیری بیٹیاں ڈبکیاں بھر رہی ہیں۔

ندی کی گود اُن کے بغیر سُونی ہے۔

ملّاح! ملّاح! بادبان کھول دے کیوں کہ یہ بے حقیقت کشتی موجوں کے تھپیڑے کھا کھا کر تھرّا رہی ہے۔

تیری جد و جہد بیکار ہے، اب فنا کا لنگر کھول دے۔

تیری جھونپڑی میں جوار بھاٹے کا پانی گھُس رہا ہے۔

تیرا اشہب عمر ساحل کی طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہا ہے۔

یہ ہمدم دیرینہ بھری برسات اور اندھیری رات میں تیرا غم گسار تھا۔

لیکن تو ہے کہ اب تک پھٹی ہوئی چٹائی پہ لیٹا ہوا ہے۔

اس غم و اندوہ کی زنجیر کو ہمیشہ کے لیے توڑ کیوں نہیں دیتا۔

تو ہیرے موتی کے خزانوں کی جستجو نہ کرتا تھا۔

اور نہ سیم و زر کی چاہت رکھتا تھا۔

تو کیا چاہتا تھا؟ — مٹی کا ایک پیالہ، ٹوٹا ہُوا دیا، چھوٹی سی جھونپڑی اور تھوڑی سی نیند!

بدبخت! یہی تو تیرا مقصدِ حیات تھا۔

لے! ان نعمتوں کو چُرانے کے لیے بیماری، پیری اور موت تیرے گھر گھس آئے ہیں۔

مانجھی! تیری ناؤ ڈوب کر زمین کی تہ سے لگ رہی ہے۔ سنبھل کہ کہیں سخت مٹی کی ٹکر سے تیرے پیر لہو لہان نہ ہو جائیں۔

لیکن تو، تو ملکِ عدم کا مسافر ہے۔ پھر تجھے کس کا کھٹکا ہے۔ بادل گھرے ہوئے ہیں، بجلی کڑک رہی ہے سمندر پیچ و تاب کھا رہا ہے لیکن تجھے ان سب کی کیا پروا ہے۔ تجھے تو زمین کے اندر جانا ہے۔

ناخدا

مسافرو! سُن رکھو کہ آدھی رات کے وقت فلک بوس پہاڑ
لق و دق صحرا اور ناپیدا کنار سمندر سے ہوکر گزرنا ہے۔
ناؤ ڈگمگا رہی ہے! پانی چڑھ رہا ہے! ناخدا راستے سے
بھٹک رہا ہے! بادبان تار تار ہوگیا ہے!
اس کٹھن گھڑی میں پتوار کون سنبھالے گا؟ ہے کسی میں ہمت؛
مستقبل للکار رہا ہے کہ جو بہادر ہیں وہ آگے آئیں یہ آندھی
بڑی بکٹ ہے۔ اس سے جوجھنے کے لیے بڑا جوکھم اُٹھانا پڑے گا۔
پھر بھی کشتی کو پار لگانا ہی ہے۔
وطن کے پاسبانو! ہوشیار! خبردار!
رات اندھیری ہے اور ہمارے کارواں کو صدیوں کا
سوزِ دل دعوتِ راہ نوردی دے رہا ہے۔
ہمارے دکھے ہوئے دلوں میں چھپی ہوئی آگ بھڑک رہی ہے
اس آگ کی مشعل سے ہمیں اپنی راہ تلاش کرنا ہے۔
بے بس قوم کا بیڑا منجدھار میں غرق ہو رہا ہے۔
ناخدا! دیکھنا ہے کہ آزادیٔ وطن کے وعدہ کو کس حد تک
نباہتا ہے۔
کون پوچھتا ہے کہ ہندو کون ہے اور مسلمان کون ہے؟
ناخدا کہہ دے کہ جو انسان غرق ہو رہے ہیں، وہ سب

مادر گیتی کی اولاد ہیں۔

پہاڑیوں کے سلسلے، رہبروں کے پست حوصلے، بجلی کے کڑاکے۔

پھر سست رفتار ہم راہیوں کے دل خوف سے کیوں نہ لرز جائیں۔

ناخدا! کیا تو بھی راہ بھول جائے گا؟ کیا اس ناؤ کو منجدھار میں چھوڑ دے گا؟

نہیں نہیں، تو اسے طغیانی اور تلاطم سے نکال لے جائے گا

ناخدا! تیرے سامنے جنگ کے میدان ہیں جن کی مٹی انسانیت کے خون سے لالہ گوں ہو گئی ہے۔

لیکن پروا نہ کر۔ ہمارا جو آفتابِ اقبال غروب ہو چکا ہے وہ ہمارے خون سے نہا کر پھر ایک بار جگمگائے گا۔

پھانسی کے تختوں پر چڑھ کر جنھوں نے زندگی کے گیت گائے تھے

وہ حسرت سے تیرا منہ تک رہے ہیں۔

تو اُن کے لیے کیا تحفہ لایا ہے؟

ناخدا! آج تیرا امتحان ہے۔ دیکھنا ہے کہ تو کس کی نجات کا جویا ہے۔ اپنی یا انسانیت کا۔

سنبھل! سنبھل! کہ ناؤ ڈگمگا رہی ہے۔ پانی چڑھ رہا ہے۔

ناخدا! خبردار! ہوشیار!

اندھا دیوتا

منزلِ موت کے مسافروں کے لہو لہان نقشِ قدم کو دیکھتا ہوا وطن کا اندھا دیوتا ادھر آ رہا ہے۔ پھانسی کی رسی ہاتھ میں لیے ہوئے!

اس کی جبین پر ایک سیاہ داغ ہے۔ صدیوں کی غلامی کا داغ۔

بے نور آسمان، اندھیری رات اور خاموش بادل! صرف کہر آلود کہکشاں کے ہاتھ میں ایک مشعل ٹمٹما رہی ہے۔

اور اُن کے بیچ سے ٹکراتا ہوا اندھا دیوتا دھیرے دھیرے چلا جا رہا ہے۔

اس کے قدم اسی طرف اُٹھتے ہیں جدھر ہڈیوں کا ساز بجتا ہے۔

دشمن جب حربہ سے وار کرتا ہے،

اسے سہارے کی لکڑی بنا کر وہ کسی نامعلوم منزل کی طرف جا رہا ہے۔

رُک رُک کر سنبھل کر اندھا دیوتا آگے بڑھتا ہے اور راستہ جتنا بکٹ ہوتا ہے اس کا جوش اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔

وہ لڑکھڑا کر گرنے لگتا ہے تو موت کا ایک نیا جویا آکر اُسے تھام لیتا ہے۔

جب کال کوٹھری کے دروازے پر قیدی اپنی زنجیروں سے
باتیں کیا کرتا ہے،

پھانسی کا جو تختہ ہمیشہ خون سے نہایا کرتا ہے،

جس جگہ روح ظلم کے تلووں تلے روندی جاتی ہے،

جہاں وحشی درندے اپنے ناخون تیز کیا کرتے ہیں،

جہاں قربانی کے جانور چیختے ہیں اور زندہ عورتیں آگ میں
جلتی ہیں

وہیں — ہاں وہیں سے ہوکر اندھے دیوتا کا راستہ گزرتا ہے
وہ پکارے جاتا ہے: " یہ لو پو پھٹ چلی، ارے نیند کے ماتو کچھ
ہوش ہے؟ دیکھو شفق نمودار ہوگئی "

لیکن ابھی اندھیرا باقی ہے اور رہرو کسی انجان سمت کی طرف
بھاگے جا رہے ہیں۔

وہ نہیں جانتے کہ دیوتا نے کہاں سے آواز دی ہے۔

وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ کوہِ ندا سے ایک صدا آئی ہے۔

قدم آپ اپنی رفتار کی چاہ میں باولے ہو رہے ہیں۔

سامنے راستہ، اوپر دیوتا۔ پھر منزل کی خبر کون لے۔

راہ میں دلدل ہے یا کھائی۔ یہ دیکھنے کی فرصت کسے ہے۔

مسافر چل رہے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ راستہ بھی
بھاگ رہا ہے۔

موت، شباب، اندھا دیوتا اور شفق کا تبسّم۔

یہ سب ہم دم اور ہم سفر ہیں! —

طائرِ صبح

اد ے او طائرِ صبح

جل آج سے میں بھی تیرا ہم نوا اور ہم سفر ہوں۔
لے اپنی ہنسی میں ئیں تیرے معصوم نغموں کو سموتا ہوں اور
تیرے سُر میں اپنا سُر پروتا ہوں۔
صبح و شام تو جو گیت گاتا ہے، وہ ایک بے نشان دیس کی طرف
پرواز کناں ہے۔
اُس گیت کی گونج ہردم رواں دواں ندی کی لہروں کے
من کی ہوک بن گئی ہے۔
سُن لے کہ میں اُن کی گت کو اپنے پیروں کا گھنگرو بناتا ہوں
اور اُن کے تال پر میری نظموں کی بحر متوالی ہرنی کی طرح
رقص کرتی ہے۔
تو جو بھی نغمہ چھیڑے گا
اسی کے سرگم پہ میری شاعری کی برکھا برسے گی۔
تیری جس پکار کو سُن کر رات کے وقت بن باسی دہل جاتے
ہیں
جسے سُن کر شفق سورج کو گود میں لیے ہوتے صبح کے دریچوں
سے جھانکنے لگتی ہے
اور گائے اپنے چرواہے کو جگانے کے لیے گلے کی گھنٹی

بجانے لگتی ہے
ارے دیوانے میں تیری اس لَے کو سیکھ آیا ہوں۔
تیرے بازوؤں کی رفعت
جن کا اشارہ دن کو اُجالتا ہے اور منہ بند کلیوں کو کھِلاتا ہے
اور جسے دیکھ کر نحیف اور ضعیف اندھیرا تنہائی کی راہ بھاگتا ہے۔
مجھے اس رفعت سے آنکھ ملانے کا موقع ملا ہے۔
اب میں بھی بلندیوں پر غزل خواں ہوں گا
اور میرے اِذن پر نیچے بہت نیچے چمپا کی بیل سجدہ ریز ہو جائے گی۔
طائرِ صبح! یاد ہے کہ میں نے بھی ایک لمحہ کے لیے تیرے آشیانے میں بسیرا کیا تھا۔
شباب! او شباب!
تیرے جوان نغموں کی تھرتھراہٹ سے میرا "دل رُبا" خود بخود بج اُٹھتا ہے۔
تیری آنکھوں کی جوت تاریکی کے جگر میں عکس فگن ہوتی ہے
اور سورج کی جبیں سے شام کے دُھندلکے کا داغ دھوتی ہے
تیری دی ہوئی جس ضیا سے مندروں کے چراغ جلا کرتے ہیں
اور جس کی ایک کرن منجدھار میں پڑی ہوئی کشتی کو راہ دکھاتی ہے

میری بے بصر آنکھیں اسی کے نور سے روشن ہیں۔
دیکھو! دیکھو کہ میرا تخیل حسن کی دنیا بسانے نکلا ہے۔

صُورِ اسرافیل

تم سب انقلاب کے نعرے بلند کرو، تم سب بغاوت کے گیت گاؤ۔

دیکھو طوفان اور آندھیوں میں بھی سرنگوں نہ ہوکر وہ دور جدید کا پرچم لہرا رہا ہے۔

قیامت کے نشے میں متوالا ہوکر تباہی و بربادی کو اشارہ دلا پر نچاتا ہوا وہ وحشی آپہنچا اور اُس نے سمندر کے سوتوں پر نشتر لگا دیے۔

اس کے مہیب اور ڈراؤنے چہرے پہ موت تبسّم بن گئی۔ عزرائیل کا محشر انگیز لبادہ اوڑھے اجل سے زیادہ عمیق اندھے کنوؤں سے سر نکال کر مشعل برق روشن کیے جب وہ قہقہہ لگاتا ہو

تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو، کیوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ۔

جب وہ اپنی زلفوں کو پھیلا دیتا ہے تو اُن میں سے شر و فساد کی چنگاریاں نکل کر آسمان میں آگ لگا دیتی ہیں۔

دُمدار ستارہ کی شرر بار نگاہیں اس کے لیے مشعلِ راہ بن جاتی ہیں۔

دنیا کے دل و جگر سے خون نکال کر وہ اپنی تلوار کو دھوتا ہے جس کی بے پناہ جھنکار سُن کر سب خاکی و نوری

دم بخود رہ جاتے ہیں۔
جب وہ فضا کو خاموشی کا سبق پڑھاتا ہو
تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو، کیوں نہ بغاوت
کے گیت گاؤ۔
آفتاب سوا نیزے پر آکر اپنی تمام گرمی اس کی آتش فگن
نظروں میں ڈھال دے گا اور اُس کے پریشان بالوں میں
فریادیں آ آکر چھپ جائیں گی۔
سمندر خشک ہو ہو کر اس کی آنکھوں کے آنسو بن جائیں گے
جب خود زمین اُس کے کاندھوں کا سہارا لے کر شورِ قیامت
پہ گوش بر آواز ہو جائے گی
تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو، کیوں نہ بغاوت
کے گیت گاؤ۔
خبردار! ہوشیار! اس بار قیامت برف کی سلیں دنیا
کے سینہ پر رکھ دے گی۔
بوڑھوں اور مردوں کے لیے اس ہنگامِ حشر میں کہیں
جگہ نہیں۔
کل یہ ہنگامہ فرو ہو جائے گا تو بنتِ نور بیوہ ہو چکی ہوگی
اس کے ماتھے کا سیندور، صبح کی لالی غائب ہو چکی ہوگی۔ چاند
کی کرنیں چنگاریاں بن کر صبر و سکون میں آگ لگا دیں گی۔
پھر کیوں نہ تم نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے
گیت گاؤ۔

وہ دیکھو دجّال نے اپنا خونیں عصا سنبھالا اور قہر و غضب کے دیوتاؤں کو آتش و باد کے کفن پہنا دیے۔

اور لو برق و رعد نے طوفان اور آندھی نے اپنے ترنم سے آسمان کے تاروں کو منتشر کر دیا۔

اسی کی ٹھوکروں سے ستارے ٹکرا ٹکرا کر شہابِ ثاقب بن گئے اور آسمان میں شگاف ڈالنے لگے۔

زلزلوں نے کنٹوؤں کو یوں اُچھال دیا کہ وہ مینار بن گئے۔

اور ایسے ہی موقع پر اگر وہ رخشِ قہر پر سوار آجائے تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ۔

مگر شورِ قیامت سے تو کیوں لرزہ بر اندام ہو رہا ہی؟

یہ تو ایک نئی دنیا کی آفرینش کا پیغام ہی۔

وہ زمانہ آرہا ہی جب کہیں کثافت اور نفرت کا نام نہ رہے گا۔

قیامت کی ان بربادیوں کے باوجود جو چیز باقی رہ جائے گی وہ جمالِ باری ہی جو از سرِ نو حسن و رنگینی کی دُنیا بسائے گا۔

جب ہر شی حسین و رنگین بننے والی ہی

تو ہم کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کریں، کیوں نہ بغاوت کے گیت گائیں۔

یہ تو تعمیر و تخریب کا کھیل ہی۔ اس سے خوف و خطر

لاحاصل ہے۔

دلہنوں سے کہہ دو کہ سہاگ کے گیت گائیں، دوشیزاؤں سے کہہ دو کہ چراغ جلادیں۔ اب دنیائے حسن تاریکی و تباہی کا لباس پہننے والی ہے۔

جب حسن کی تخلیق بھی بربادی کے ہاتھوں ہوتی ہے تو ہم کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کریں، کیوں نہ بغاوت کے ترانے گائیں۔

کوئی زنجیر ہلاتا ہی!

دروازے پر طوفان دستک دے رہا ہی۔

اُٹھ، ای جواں مرد اُٹھ اور دروازہ کھول۔

مہرِ تاباں کی شعلہ ساماں اور آتش بیاں زبان للکار رہی ہی کہ شباب کا یہ مرحلۂ شوق حیاتِ دارین حاصل کرے۔

آشفتہ و وارفتہ لیلئ شب رخصت ہو رہی ہی اور فضائے بسیط کی ردائے سُرمگیں میں اس کا دمِ واپسیں سُنائی دے رہا ہی۔

لیکن ادھر دیکھ کہ منزلِ شوق کا مسافر تجلّی کی مشعلیں لیے اُفق پر نمودار ہو رہا ہی۔ نیند کے جاگے مُرغانِ چمن اُس کے خیر مقدم کے گیت گا رہے ہیں اور ہوا کے جھونکے خوشی کے بوجھ سے دب رہے ہیں۔

آسمان پر بجلی کے کڑاکے نوبت بجا رہے ہیں، آندھی سوکھی پتیوں کے گھنگرو پہنے خوشی کے نشے میں چور لڑکھڑا رہی ہی۔ غم کے آنسو اور ظلم کے خون میں نہا کر وہ جمیل و شکیل ادھر آ رہا ہی۔

تابستان کے بائیں ہاتھ میں اس کا خاک آلود پرچم لہرا رہا ہی۔

اور اس کا چہرا زخموں کے مارے لہو لہان ہو گیا ہی۔

او شباب! اور پیغمبرِ جدید! کیا تو میرے دُکھ درپن میں اپنا منہ دیکھ رہا ہی؟

کتنے اشک جم جم کر آنسو بنے ہوں گے۔ تب کہیں تیری تلوار تیار ہوئی ہوگی۔

ای شباب! تیری دُور افتادہ منزل کو میرے نغمے آسان اور گوارا بنا رہے ہیں اور میں تیرے مستقبل کے خد و خال تیار کر رہا ہوں۔

میرے گونجتے اور گرجتے ہوئے گیت صبح و مسا تیری آمد آمد کا ترانہ سُناتے ہیں اور میری آواز صورِ اسرافیل کی طرح تیری کامرانی کا پیام سناتی ہی۔

میرا پیام اہلِ دل میں ہیجان و اضطراب کی آگ بھڑکاتا ہی۔ اور میں تن تنہا تیرا علم بردار بن کر تاریکی میں اُمید کی ضیا پھیلا رہا ہوں۔

شب بیدار نشان بردار پکار پکار کر کہہ رہا ہی کہ کاروانِ شباب کے سورماؤ! خوب سے جاگو آنکھیں مل ڈالو۔ جاگو جاگو کہ طوفان دروازے کی زنجیر ہلا رہا ہی۔

دیکھو دیکھو کہ انقلاب کا دیوتا تمھارے سرہانے آکھڑا ہُوا ہی۔

یہ دیوتا ہر زمانے میں آتا ہی اور ایک نئے دور کا سندیسہ لاتا ہی۔

وہ بار بار اذن دیتا ہے۔ در در جاکر پکارتا ہے لیکن تم پھر بھی بیدار نہیں ہوتے اور بربط کے تار تھک کر ٹوٹ جاتے ہیں۔

آخر کار، دیوتا مایوس ہو کر واپس چلا جاتا ہے اور تمہاری تواضع کے بے گھناؤنے بڑھاپے اور مکروہ موت کو چھوڑ جاتا ہے

لیکن اگر اس بار وہ دیوتا دروازے توڑ کر اور تدّبی، پہاڑ، جنگلوں سے گزر کر تمہیں دعوتِ ہم رکابی دینے آئے

تو او پجاریو! لِللہ اس کے ساتھ ہو لینا۔

بار بار جس کی خود داری کو تم نے مجروح کیا ہے بار بار جس کے مندر کے دیے تم نے بجھا دیے ہیں، اب اُس کی صدا پر لبیک کہنا ہی ہوگا۔

اپنے آپ کو مسوس کر قربانی کی جو ڈال تم نے سجائی ہے آج اسے ہم خونیں دیوتا کی بھینٹ چڑھائیں گے۔

ہم جیتیں یا ہاریں، لیکن اس مرتبہ سربلند ہو کر یہ کہہ سکیں گے کہ ہم نے تیرے علم کو فلک کے مینار سے باندھ دیا ہے۔

ہم نے تیرے حکم پر سرِ تسلیم خم کیا ہے اور قربانی کی راہ میں اپنے کو مٹا دیا ہے۔

ہم تیرے قدموں کے تلے اس شان سے کھڑے ہوئے ہیں کہ آسمان کو سر پر اور ستاروں کو پیشانی پر اُٹھا لیا ہے۔

او رہنما! ہم تیری خاکِ پا کو آنکھوں کا سُرمہ بنا کر اسی رستے پر چل رہے ہیں، تیرا ہی نور ہماری آنکھوں کی جوت ہے۔

آخری شب چور رستے سے دشمن کے سپاہی یک بیک نکلے
اور ہم پر شبخون مارا۔ انھوں نے تیری تجلّی کی رہ گزر کو تاریک
کردیا ہے۔ دشمن افترا کے پتھروں کا پہاڑ کھڑا کر رہا ہے اور قدم
قدم پر فریب کے کانٹے بچھا رہا ہے۔

اس کے چہرے پر رعونت کی سیاہی پھیلی ہوئی ہے اور وہ
فتنہ و فساد کے نعروں سے زمین و آسمان میں لرزہ ڈال رہا ہے
او شمس گہر ریز! وہ پھونکوں سے تیرے چراغ کو بجھانا
چاہتا ہے۔

اے خالقِ جدید! تیرے اشارے پر کس عزم و استقلال
سے اسی راہ پہ چل رہا ہوں۔

ہر رُکاوٹ اور ہر پابندی کو توڑ کر میں اپنی منزل کی طرف
لپک رہا ہوں۔

میں کسی الہام کا قائل نہیں۔ کسی مذہبی کتاب کو میں نے
اپنا ہادی نہیں بنایا۔

فقط تیری آواز کو میں نے سُنا ہے اور اُس کے آگے
سر جھکا دیا ہے۔ جب جب تو نے مجھے پکارا ہے، مجھے یہی جواب
ملا ہے کہ ہاں ہاں میں ثابت قدم ہوں، میں اٹل ہوں، میں
اچل ہوں۔

جب جب دشمن نے تیرے آئینۂ جبیں پر کلنگ کا ٹیکہ
لگایا ہے، میں نے اپنے خون سے اسے دھو ڈالا ہے۔

اس مایا ندی کو ہم کب پار کریں گے؟ فریب و دجل کے اس ریگستان سے ہم کب نکلیں گے؟ کب ہم صداقت و راحت کے ساحل کو دیکھ سکیں گے؟

ناخدائے انقلاب، معبودِ شباب!

کچھ تجھے بھی اس کا حال معلوم ہے؟

او برق گفتار! اس شہر خموشاں میں آ اور ہمیں زندگی کے سبق پڑھا۔

ہمیں امید کی روشنی دے، اعتماد کی طاقت دے۔ درندوں کے اس دیس میں، اس دم گھوٹنے والے قیدخانے میں ہمیں راحت کی دو چار گھڑیاں عطا کر۔

دیکھو دیکھو، ستارے جھوم جھوم کر گا رہے ہیں

"مُردہ باد پیری، زندہ باد جوانی"

دیکھو دیکھو، چاند کی کرنوں پر یہ ساز سُنائی دے رہا ہے۔

حیات و حُسن کے پیامبر! تو جُگ جُگ جیے۔

تباہی اور بربادی کے پاسبان! تیری موت سر پر کھڑی ہے۔

شامِ وطن

صدہا سال گزر گئے
اور لیلیٰ شب اب تک مشرق کی دہلیز پر آنکھیں لگائے
بیٹھی ہوئی ہے۔
ندامت کے رنگ میں شرابور ہوکر قسمت کا ستارہ ڈوب گیا
اور ہم ہیں کہ اب تک اس خفّت کا داغ نہ دھو سکے، ہمارا
خون پی پی کر موت زندہ ہے۔
اور اس طریقے سے ہم اپنے اجداد کا قرض ادا کر رہے ہیں
بھارت ماتا! تجھے معلوم ہے کہ صبح صادق کا مُنھ ہم کب
دیکھیں گے؟
جب ہاری ہوئی بازی کی شرم کے مارے شامِ وطن کا
چراغ بجھ گیا۔
لاریب کہ ہم صدیوں سے اس کی لو کو اُکسا رہے ہیں جب
ہماری جبیں کا لہو کا ٹیکا شفق کو لالہ گوں بناتا ہے تو زمانہ اُسے
دیکھ کر چیخ اُٹھتا ہے کہ اے لو وہ صبح ہو چلی۔
لیکن اُمید کی جو نوید ہم خونِ جگر سے لکھتے ہیں اُسے قسمت
کے جابر ہاتھ فوراً مٹا دیتے ہیں۔
کیا یہ شام کبھی نہ کٹے گی؟
ایک نسل کی سیاہ کاریوں کا بار اور کتنی نسلیں اُٹھاتی

رہیں گی؟

ان گنت ہاتھ بے شمار دلوں کے سیپارے پوجا میں چڑھانے لائے ہیں۔

مادرِ وطن، جاگ جا اور اس نذر کو قبول کر لے۔

اگر ہمارے گناہوں کی کوئی تلافی نہیں، اگر ہماری شام کی کوئی صبح نہیں تو لِلّٰہ اُٹھ اور ہم سب کو فنا کردے۔

ہمیں درندگی کی زندگی اور بے حیائی کی موت گوارا نہیں۔

مرنا ہی تو ہم دیوتاؤں کی طرح کیوں نہ مریں۔

جوانی اور پیری

جوانی کے اُمنڈتے ہوئے دریا کو کیا تو بالو کی دیواروں سے روک سکے گا؟

جب آسمان پر بدرِ منیر رونما ہو رہا ہو تو سمندر کے جوار کا احاطہ کون کر سکتا ہو؟

چاند اُن کے لیے نکلا ہو جنھوں نے منجدھار میں ناؤ بہا دی ہو نہ کہ اُن کے لیے جو گندی نالیوں اور تنگ اور تاریک کنوؤں میں مینڈکوں کے ساتھ پڑے اپنی قسمت کو سراہ رہے ہیں۔

دریائے زندگی کا سیلاب جب قدامت اور رجعت کے گھاٹوں کو تہس نہس کر دیتا ہو تو شاخِ پیری پر بیٹھ کر ایک پر شکستہ کوّا اُسے کوسنے لگتا ہو۔

لبِ دریا کی اس کائیں کائیں پر کان نہ دے کر شاہین اُن لہروں کا ہم رکاب ہو جاتا ہو جو ساحل کی قید سے آزاد ہو کر ہر طرف بربادی کی نیلی چادر بچھا دیتی ہیں۔

× × × × × × × × × × × ×

رواں دواں دریا کے کنارے، غلاظت اور کیچڑ میں، گِدھ اور کوّے سڑی ہوئی لاشوں کی تاک میں بیٹھ جاتے ہیں۔

موت اور وبا کے ہم نفس یہی ہیں۔

مگر او بلبلِ ہزار داستان! — او مؤذنِ فجر! کیا ان کی

غضب ناک نگاہوں سے گھبرا کر تو طلوع زندگی کے گیت گانا چھوڑ دے گا؟

یہ تو بُزدلی اور منافقت کے بندے ہیں۔
قسمت کے سنتری اور مکر و دجل کے دلّال ہیں۔
درحقیقت کافر و ملحد یہی ہیں کہ انسانیت کے خون کی بوند بوند پی ڈالتے ہیں۔

× × × × × × × × × × ×

تم سب شباب سے بغل گیر ہو جاؤ۔ غیر فانی جوانی کا بانی اس زمین پر ایک ردائے نیل گوں بچھا دے گا۔
موت کے جو جراثیم توہمات کی چہار دیواری میں جینے کے عادی ہیں۔
انھیں کیا معلوم کہ یہ جھرنا بحرِ حیات کی تلاش میں کس طرف بہا جا رہا ہے۔
جو چمگادڑ آنکھیں بند کیے کسی تاریک حجرے میں پڑی رہتی ہے
اسے شفق کی لالہ کاری سے کیا مطلب؟

× × × × × × × × × × ×

سورج کی کرنوں سے چندھیا کر درخت کے تنے سے سر نکال کر اگر اندھا سانپ پھنکاریں مارتا ہے تو میرے گیت مور کی للکار بن کر اُس کے لیے پیامِ موت ہو جائیں گے۔
جن کی زندگی میں اندھیرا ہے، وہ اگر نفیرِ صبح سے برہم ہو کر بسترِ مرگ پر پڑے پڑے گالیاں دیں تو تو اُن کے ہذیان پر

کان نہ دے۔

ان کے بیے زمانہ اپنے ہاتھوں سے قبر کھود رہا ہے۔ تو اپنے پاک آبِ زندگی کو ان نیم‌دوں کی لاشوں سے ناپاک نہ کر۔

اسیر مینا جھوٹے ٹکڑے کھاکر پنجرے میں بیٹھی سکھائے ہوئے گیت گا رہی ہے۔

او آزاد پپیہے! فضائے آسمانی کو اپنے ظلم شکن نغموں سے تھرّا دے!

تو عرش کی بلندیوں پر رہتا ہے، ان گبریلوں کی پروا نہ کر۔

مٹی کے تیل کا دھندلا چراغ چاندنی کو بے نور نہیں کر سکتا۔

یہ تو آبِ جو کی سطح پر لوٹنے والے جنگلی درندے ہیں جن کا کام ہی چھینٹیں اُڑانا ہے۔

تو سر بلند کنول کا پھول ہے جو ہمیشہ اپنی نکہتِ عنبریں سے ہوا کو جانفزا کرتا رہے گا۔

× × × × × × × × × ×

تیرے شفاف جسم میں وہ اپنے بدن کا میل لگانا چاہتا ہے۔

تو آزردہ نہ ہو کہ جس کے پاس جو ہے وہی تو دے گا۔

درخت اپنی شاخوں کو پھل اور پھول سے سجاتا اور پرندوں کو زمزمہ پرداز کرتا ہے۔

اگر کوئی دو پایہ کلھاڑی چلائے تو اس سے درخت کی توہین تو نہ ہوگی۔

اگر پھولوں کو توچ کر بندر خوش ہوتے ہیں تو کیا باغبان تو

درد سے چیخ اٹھتا ہے

شباب! پھر تو بڑھاپے کے کوسنوں سے کیوں چڑھتا ہے؟

اس کا جنازہ تو کل ہی نکلنے والا ہے

جس دشت میں تو آبادیاں بسائے گا، اگر اس کے کانٹے تجھے چھیڑتے ہیں تو ہراساں نہ ہو کہ ایک جنبشِ پا سے تو انھیں روند سکتا ہے۔

مغرور جوانی ہر زمانے میں حکمراں رہتی ہے۔

وہ نہ کبھی بڑھاپے کے آگے سرنگوں ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔

× × × × × × × × ×

ہم ایک نئی دنیا بسائیں گے۔ ہم ایک نیا نغمہ چھیڑیں گے۔

اور یہ زمین ادب سے جھک کر ہمارا تحفہ قبول کرے گی۔

ہم نوجوان ہر زمانے میں بوڑھوں کو قبر میں اُتارنے آئے ہیں

اگر وہ گالیاں دیں تو ہمیں ہنس کر کہنا چاہیے۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون"

بیداری کا راگ

جو جاگتے ہوئے بھی غفلت کی چادر اوڑھے پڑے ہیں ارے

نادان، ان کے دروازے پر تو کب تک دستک دیتا رہے گا؟

جو لوگ مخملی لحافوں میں لپٹے پڑے ہیں،

ان کے لیے زندگی ایک طویل رات ہے۔ وہ ہمیشہ نیند کے

ماتے رہیں گے۔

اور تیری آواز انھیں کبھی نہ جگا سکے گی۔

جنھوں نے طوفان سے بچنے کے لیے ساحل پر مکان بنا لیا

اب اُن کا شانہ ہلانا لاحاصل ہے۔

جس نے گھر کے اندر گھس کر دروازے کے ارگل کو سختی سے

بند کر دیا۔

اس سے کیوں التجا کریں کہ دم بھر کے لیے کواڑ کھول دو۔

مسافر! اس راہ کو بھول جا۔

سپنا پوری میں بیداری کی شہنائی کو کون سنے گا؟

لیکن اس موت کی خاموشی کو توڑ کر کبھی کبھی ایک فریاد بھی

سُنائی دیتی ہے۔

یہ اس کا شیون ہے جسے ہلاکت کی افیون کھلائی گئی ہے۔ تاکہ

وہ ہمیشہ سوتا رہے۔

مغنّی! اسے جگانے کے لیے تو نیا ساز اُٹھا اور نئے انداز سے گا

وہ نشّے میں ہے اور اُسے نہیں معلوم کہ وہ کہاں پڑا ہُوا ہے۔
اسے کیا خبر کہ کوئی اس کے جگر کا خون بوند بوند کر کے پی رہا ہے۔

دورِ جدید کے نقیب! تو اس کے دل میں اپنا جادو جگا کیونکہ تیرے راگ کو ایک یہی خفتہ نصیب سمجھ سکتا ہے۔

اُن وحشیوں کا دل ایک ریگستان ہے جس میں نہ پھول ہے نہ پانی؛
لیکن وہ گدیوں پر بیٹھے دنیا کی نعمتیں چٹ کر جاتے ہیں۔
یہ کیوں ہو کہ جنھوں نے درندوں کو نکال کر بڑے بڑے نگر بسائے۔

وہ خود انسان نما حیوانوں کے خوف سے موریوں میں سڑا کریں
یہ کیوں ہو کہ یہ خونخوار درندے انسانوں کا بہروپ بھر کر تہذیب کے ٹھیکے دار بن بیٹھیں۔

ظالم وہ ہے لئیم وہ ہے جو انسان کا خون پیتا ہے پھر تو ان ابلہ فریب ستم گروں کے خلاف کیوں نہیں اُٹھ کھڑا ہوتا۔
ہزاروں سال سے استبداد کا درخت پھل پھول رہا تھا۔
آج اُس کی جڑ کٹنے کا وقت آ گیا۔
نئی دنیا کے شاعر! پھر کیا دیر ہے۔
چھیڑ دے وہ ساز جو حقیر مٹی کے ذرّوں کو عرشِ بریں سے ٹکرا دے!

افلاس سے خطاب

ای افلاس! تو نے ہی مجھے یہ عظمت بخشی ہی۔
عیسیٰ کے سر پر کانٹوں کا تاج کتنا بھلا معلوم ہوتا تھا،
مرحبا کہ اسی زینت سے تو نے مجھے بھی سرفراز کیا اور وہ جواں مردی
عطا کی جو نورِ حقیقی کی پروردہ ہی۔
میری نگاہ کو تو نے آتش فگن اور میری زبان کو تُند خو بنایا۔
اور یہ تیری ہی تربیت کا اثر ہی کہ میرا نغمہ اُپنی تلوار سے زیادہ
تیکھا ہو گیا۔

× × × × × × × × × × ×

مگر ای ستم گر! تیری قیامت خیز تپش نے میرے کُندن جیسے
جسم کو گلا ڈالا۔
بتلا بتلا وہ جمالِ جاں آفریں کیا ہوا؟
ان لاغر ہاتھوں تک ابھی مد کا پیالہ آیا بھی نہ تھا کہ او لئیم!
تو نے کس بے دردی سے اُسے چُور چُور کر ڈالا۔
وہ فردوس بریں اب میرے لیے ایک طلسم خیال ہی اور بس!
اب تو میری آنکھیں میرے ہی گھر بار پر آگ برساتی ہیں۔

× × × × × × × × × × ×

میری آرزو ایک کلی تھی جو درد کی شاخ میں جھول رہی تھی
ظالم ابھی وہ کھلنے نہ پائی تھی کہ تو نے بھوک کی کُلھاڑی سے

اسے شاخ سمیت کاٹ ڈالا۔
کڑکڑاتے جاڑوں کی صبح کی طرح میرا دل لرزتا تھا۔
جیسے اُس سے بھیگی ہوئی زمین کو بادِ زمہریر بوسہ دے رہی ہو
شبنم کی بوند میں درد کا دریا تیر رہا تھا۔
آہ، تو نے دھوپ بن کر اسے خشک کر دیا۔
راحت و آرام کی سپنا پوری اُجڑ گئی۔
میرے حلق میں یکھ کا گھونٹ ڈال کر تو پوچھتا ہے "آبِ حیات میں کیا رکھا ہے۔ نہ سرور ہے اور نہ خمار"۔
بدبخت! اس دکھیاری دنیا میں جینا تیرے بس کی چیز نہیں!
تو نے افلاس کی گود میں پرورش پائی ہے۔
کانٹوں کے کنج میں بیٹھ کر آنسوؤں کے ہار گوندھا کر۔
درد تیری کتاب زندگی کا عنوان ہے۔
اس حد تک فریاد کر اور مصروف شکوہ سنجی رہ کہ تیری قوتِ گویائی ختم ہو جائے۔
اے غیظ و غضب کی مورت! کشکولِ گدائی لے کر در در کی ٹھوکریں کھا۔
جہاں عاشقوں کے لیے لیلیٰ شب مسرت کا پیغام لے کر آئی ہو وہاں جا کر دستک دے اور کہہ: "یہ دنیا عیش کدہ نہیں ہے یہ جہاں اس لیے ہے کہ فراق میں تڑپو اور جدائی کے صدمے جھیلو۔ محبوب کی آغوش کانٹوں کی سیج ہے اسی پر لوٹتے رہو"
یہ سُن کر ایک آن میں یاس رنگ کی وہ محفل اُجڑ جاتی ہے۔

اور شمع یہ کہہ کر دم توڑ دیتی ہی کہ موت کی یہ رات کاٹے نہیں کٹتی۔

بھوک کا مارا نحیف و لاغر جسم آنکھوں سے انگارے برسانے لگتا ہی۔

ہر طرف سے قحط اور وبا کے قہقہے سُنائی پڑتے ہیں۔

گلستانوں میں خزاں آجاتی ہی اور محلوں کا نام و نشاں نہیں رہتا

× × × × × × × × × × ×

افلاس! تیرے آئین میں صرف ایک سزا ہی۔

تباہی اور بس!

تہذیب و تمدن کو تو پیروں تلے روندتا ہی۔

شرم و حیا کے نام سے بھی تو واقف نہیں۔

رقص عُریاں تیرا محبوب مشغلہ ہی۔

جو بھی سربلند ہؤا تیرے ایک اشارے پر فنا ہوگیا۔

بہت سے دیوانے تیرا ارشاد بجا لاکر ہنستے ہنستے پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں۔

بھوک کے ایندھن سے موت کی آگ کو سُلگا کر تو کتنا مسرور ہوتا ہی۔

دولت کی دیوی کے تاج کو کیسی بے باکی سے تو ٹھکرا دیتا ہی

× × × × × × × × ×

کل صبح آنکھ کھلی تو شہنائی کا جگر سوز ترانہ سننے میں آیا۔

جیسے کوئی بھولا ہؤا آج بھی گھر نہ لوٹا ہو اور شہنائی اسے

رو رو کر بُلا رہی ہو۔

دُلھن کا دل شہنائی کے سُروں کے ساتھ یوں تڑپنے لگا گویا یتیم جواب میں دُور سے آیا، آیا کہہ رہا ہو۔

سکھی یا اللہ بتلا، آنکھیں یوں کیوں پونچھ رہی ہی کہ کاجل بھی بہہ گیا۔

اور آج صبح بھی اٹھ کر سنا کہ شہنائی آؤ آؤ، کہہ کر رو رہی ہی۔

سوگوار پھول بیوہ کے تبسم کی طرح ٹپک پڑا۔

اللہ اللہ! اس دلِ ناداں کو دیکھنا کہ کتنا بے قرار ہو رہا تھا اور آمدِ بہار کے گیت کیسے مزے لے لے کر گا رہا تھا۔

مگر خود بخود میری آنکھیں کیوں ڈبڈبا گئیں؟

میں سہم کیوں گیا؟

میرا دامن کوئی زمین کے آنچل سے باندھ رہا ہی۔

شاید یہ میری ننھی بچّی ہی— میری لختِ جگر!

آہ! میری بچّی جاگ اُٹھی، اُس نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔

اُسے میں دودھ کی دو بوند بھی نہیں دے سکتا۔

مجھے خوش ہونے کا کیا حق ہی؟

گویا غربت اس بچّی کی صورت میں میرے گھر میں پیدا ہوئی ہی۔

اور مجھے افلاس کا نوحہ سُنانے کو مجبور کر رہی ہی۔

میرے نصیب میں نہ حسن و عشق ہی اور نہ مے و ساغر۔

مجھے پینے کو زہر ملتا ہے اور کھانے کو غم و یاس۔
آج تک وہ شہنائی درد بھرے سُروں میں گایا کرتی ہے۔
کچھ نہیں ہے، کچھ نہیں ہے!"

میرے نغمے

جنھوں نے کوہ و بیاباں کے دامن میں شاداب فصلیں کھڑی کردی ہیں،
جن کی مضبوط مُٹھّیاں پھاوڑے چلاتے چلاتے پتھر کی طرح سخت ہوگئی ہیں،
سہمی ہوئی زمین جن کے آگے پھولوں کی ڈالی پیش کیا کرتی ہے،
میں اُنھیں کے گیت گاتا ہوں۔
حیوانوں اور درندوں کی یہ بستی، موت اور بڑھاپے کی یہ دنیا۔
جن کے جتن سے سدا بہار گُل بن بن گئی،
جنھوں نے محبت کے ترانے ایک نئی لَے میں گائے۔
اور جن کے نعروں کو سُن کر یہ کائنات خلا میں چکّر لگانے لگی
میں انھیں کے گیت گاتا ہوں۔
جنھوں نے آن کی آن میں ہزاروں جنتیں بنا کر مسمار کردیں،
جن کی زندگی کی روانی کوئی نہیں روک سکا،
جنھوں نے ہمالیہ کی چوٹی پر کھڑے ہوکر سورج سے باتیں کیں،
جنھوں نے سمندروں کو بے آب کردیا،
نئی دنیا کی تلاش میں، جو پرستانوں کو چھان آئے اور ہواؤں میں تیرتے پھرے،
میں اُنھیں کے گیت گاتا ہوں!

شباب کا ولولہ بے قید ہے۔ وہ چاند ستاروں میں، جنت اور
دوزخ میں، عرش پر اور فرش پر۔ ہر طرف پیامِ زندگی سُناتا پھرتا ہے۔
وہ زندگی کا سودا خریدنے کے لیے موت کے بازار میں جاتا ہے۔
اور میدانِ جنگ کے قمارخانوں میں زندگی کا جُوا کھیلتا ہے۔
میں جو ایک شاعرِ بے نوا ہوں، اس کی حمد و ثنا کے سوا
اور کر ہی کیا سکتا ہوں۔
جو ہر زمانے میں اور ہر دور میں انقلاب کا پرچم لہراتے ہیں،
جن کا لبریز شوقِ زندگی اپنے سکون کے لیے زہر کے پیالوں
اور پھانسی کے تختوں کا جویا رہتا ہے،
جو پہاڑی ندیوں کی طرح کسی رُکاوٹ کی پروا نہیں کرتے،
جنھیں کم نظر بددعائیں دیتے ہیں اور کم ظرف بد اخلاق
کہتے ہیں،
میں اُن کی چوکھٹ پر سر جُھکاتا ہوں اور انھیں کے گیت
گاتا ہوں۔

ستارۂ تخریب

میں ہر زمانے میں، میں ہر دور میں آتا ہوں،
ہنگامِ قیامت کا پیغام لے کر۔
میں اہرمن کا قاصدِ اجل ہوں — میں ستارۂ تخریب ہوں۔
میری جبینِ فتنہ ساز صدہا جہنموں کی آگ سے روشن ہے۔
بربادی کے دیوتا کی آہِ آتشیں میرے دل کو سلگا رہی ہے۔
میں بد دعاؤں کی تلخ کامی اور تباہ کاری ہوں۔
اور میں وہ آوازِ توبہ ہوں جو زبانِ یزداں سے بلند ہوتی ہے، اپنی مخلوق کی سیاہ کاریوں کو دیکھ دیکھ کر۔
بصورتِ صحرا میں دنیا کے جگر کا داغ بن کر روتا ہوں۔
میں سراپا بد دُعا ہوں — آتش کام اور جہاں سوز۔
میں خلا میں بربادی کا پرچم لہراتا پھرتا ہوں۔
اور عرشِ بریں کی طرف بھی زہر و آتش کے تیر پھینکنے نہیں جھجکتا۔

گرج اور کڑک، دھماکے اور شرارے، چیخ اور پکار — وہ دیکھو اپنی دُم کی مشعل سے مَیں نے دُنیا میں آگ لگا دی اور جہنم بدوش شہابِ ثاقب کی بارش شروع کر دی۔
میں کئی بار دنیا کو تہ و بالا کر چکا ہوں اور ابھی ایسی صدہا کائناتوں کو فنا کر سکتا ہوں۔

میں وہ بلائے ناگہاں ہوں جو زندگی کی عبارت موت کے قلم سے لکھا کرتی ہے۔

زہر میں بجھی ہوئی آتشِ سیال میری رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے۔

اور میں لڑکھڑاتا، گرتا پڑتا ہوا اس راہِ فنا سے گزر رہا ہوں۔

مجھ رندِ خراباتی کے دہشت ناک گیتوں کے آگے بھونروں کی گونج ۔

میری آتش فگن زلفوں میں پیغمبروں کی محشر انگیز بد دعائیں جادوئے سامری کو جگایا کرتی ہیں۔

میں ہر زمانے میں، ہر دور میں آتا ہوں
ہنگامِ قیامت کا پیغام لے کر۔

میں اہرمن کا قاصدِ اجل ہوں۔ میں ستارۂ تخریب ہوں۔

میں ہر زمانے کی فریب کاری اور معبود کی ہوشیاری کو خوب سمجھتا ہوں۔

قدرت کے نظام و آئین پر میں ٹھوکر مارتا ہوں اور اس کے احکام کو پائے استغنا سے روند ڈالتا ہوں۔

میں جانتا ہوں کہ مشیت ایزدی ایک افسانہ ہے۔

میرا رقصِ شرر بغاوت اور انقلاب کی آندھیوں کو تُندی کا سبق دیتا ہے۔

میری ایک پھونک دوزخ کے کل چراغ گُل کر دیتی ہے اور

میں حقارت سے موت کے منہ پر تھوک دیتا ہوں۔ صورِ اسرافیل پھونک کر میں طبلِ جنگ میں اُس کی صدائے بازگشت سُنتا ہوں۔
اور میری زہریلی سانس سلطنتوں کے لیے طوائف الملوکی بن جاتی ہے۔
میں گویا مرچ کی ایسی تیزی ہوں جس سے بچّے تڑپ تڑپ جائیں۔
اور میں قید خانے کی کال کوٹھریوں میں گندھک اور پٹاس کا دُھوَاں ہوں جو ہر سانس کا دم گھونٹ دے۔
آگ پہ کلیجوں کو بھون کر کھانے والے آدم خوروں کی طرح میں مخلوق اور خالق سب کو چبا جاؤں گا۔
جنّت کی ساری شراب اور جہنم کی ساری آگ میں ایک جُرعہ میں پی لوں گا۔
میں اہرمن کا قاصد ہوں۔ ہر زمانے میں ہنگامِ حشر کا پیام لاتا ہوں۔
میں ستارۂ تخریب ہوں۔
میں دھرتی ماتا کی سرکش اولاد ہوں۔
اس قدر سعادت فروش اور وفا نا آشنا کہ میں اسے اسی کے آتشِ غم میں جھونک دوں گا۔
اس آگ کو میں تباہی کے پنکھے سے ہوا دوں گا، یہاں تک کہ زمین و آسمان اس میں جل کر خاک سیاہ ہو جائیں گے۔
میرے ہاتھوں میں مصائب و آلام کی مشعل روشن ہو!

سُن لو اے فانی اور ابدی ہستیو! میں اس جہان کے معبود کو بھی جلا ڈالوں گا۔

سُن رکھو کہ میں شیطان کا ہم نفس، ہم نوا اور ہم دم ہوں۔
ایک روز اسی آگ میں خدا کو جلانے کی غرض سے میں مجسم آتش کدہ بنا رہتا ہوں۔

یک آواز تم سب کہو۔
"تو سراپا بد دعا ہے، تو شیطان ہے، تو مالکِ اجل ہے۔
نہ تو کسی سے ڈرتا ہے۔ نہ تجھے کوئی مار سکتا ہے۔
تو قیامت کا پیام بر ستارۂ تخریب ہے۔
تو دیوانگی اور وحشت کی روشنی ہے۔
تو دجال ہے، تو قہر و غضب کا دیوتا ہے!"

بجا اور درست! - ہاں ہاں - میں نقیب قیامت ہوں، میں ستارۂ تخریب ہوں۔

میں آگ کی سیڑھی لگا کر خانۂ خدا پر چڑھ جاتا ہوں اور کرسیٔ عرش پر آرام کرتا ہوں۔

لوگ مجھے عزرائیل - عزازیل اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں
خدا کے القاب ۹۹ ہیں اور میرے پورے ایک سو!

میرے بالوں میں برق و رعد تڑپتے ہیں، دو بائیں آزاد ہونے کے لیے ملکتی ہیں۔ قحط باہر نکلنے کو مچلتا ہے۔

میرے خوف سے دُنیا کے تاج دار ہمیشہ لرزہ بر اندام رہتے ہیں کہ کہیں میں اُن کے نصیبوں پر تباہی کی مُہر نہ لگا دوں۔

اس زعم میں متوالا ہوکر جب میں قہقہہ لگاتا ہوں تو اسے دعوتِ عمل سمجھ کر لُو اور آندھیاں کروٹ بدلنے لگتی ہیں۔

جب میں آسمان پر نمودار ہوکر پیچ و تاب کھانے لگتا ہوں تو میرے سانس کی لپیٹ سے خفتہ کوہ آتش فشاں تازہ دم ہوجاتے ہیں اور میرے دم کے چابک سے زہریلے سانپ جاگ اُٹھتے ہیں۔

جس طرح موت اپنے شکار کی شمع زندگانی یک بارگی گُل نہیں کرتی

اُسے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی اور اُمید و بیم کے کھیل میں اُس کی جان کو پاش پاش کرکے سلب کرلیتی ہے

بس اُسی طرح میں دن رات خدا کو شکار بناکر اُس کی زندگی یعنی دنیا کو موت کے گھاٹ اُتار رہا ہوں۔

میں اہرمن کا قاصدِ اجل ہوں۔ میں ستارۂ تخریب ہوں۔ میں نقیبِ محشر ہوں۔

ایک بار پھر میں مئے خونیں کے نشے میں سرشار ہو رہا ہوں۔

کیوں نہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس بساط کو اُلٹ دوں۔

خوفِ خدا؟ — اونہہ — وہ خدا تو میرا کھلونا ہے۔

میری آگ بھری چٹونیں ہی اسے بے دم کرنے کے لیے کافی ہیں۔

اُس کی حالت تو اُس بچّے کی سی ہے جس کے پالنے کے اِرد گرد ایک ہیبت ناک اژدہا رینگ رہا ہو اور پھنکاریں مار رہا ہو اور بچہ اُسے تاکتا تاکتا دم بخود رہ گیا ہو۔

اسی طرح تخریب کے دوارہ خدا کی ہستی کو معدوم کر رہے ہیں۔
اسی بچّے کی طرح اس دکھیاری دنیا کی گود میں خدا ہراس
سے آہ و زاری کر رہا ہے۔

ستارۂ تخریب اس سوچ میں ہے کہ پہلے کس کی روح کو
پھونک دے؟ ۔ خالق کی یا مخلوق کی!

پیامِ شباب

میں اس شباب کے گیت سناتا ہوں
جو آج تلوار لیے ہوئے اس نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوا ہے۔
جس کی یر بادکن تاریخ میں ماضی کے اوراق گم ہو جائیں گے
جس کی سانسوں کی لپٹ میں دقیانوسی کتابیں جل جائیں گی
جو ان عبادت گاہوں کو تاخت وتاراج کرتا چلتا ہے جن میں بزدل بوڑھوں نے گناہ و معصیت کا مرکز بنا رکھا ہے۔
جس کی زندگی کی روانی میں رسم و رواج کی چٹانیں بہ جاتی ہیں، قدامت کی ہڈیاں چکنا چور ہو جاتی ہیں،
جو بلاخوف و خطر فریب و تزویر کی کمندوں کو تار تار کر ڈالتا ہے،
جس کی جرأت رندانہ قسمت کی پابندیوں کو ٹھکرا دیتی ہے،
جو گورِ غریباں کے ان پھولوں کو مسل ڈالتا ہے جن کے ہار زندگی آج پہنے ہوئے ہے۔
ہاں میں اسی شباب کے گیت سناتا ہوں۔ میں ان کے گیت گاتا ہوں۔

جو چوگانِ ہستی میں آج سب کے پیش رو ہیں۔
صبح تک بھی وہ مسافر ساحل کو نہ پہنچا جس نے اس اندھیری

رات کو تلاطم خیز دریا میں اپنی ناؤ ڈال دی تھی۔
اسی دیوانے کی یاد میں ہش نالۂ نیم شبی میں مصروف ہوں
چراغ کی دھندلی روشنی میں بیٹھے ہوئے میں چاہتا ہوں
کہ نیند کی صورت میں وہ آجاتے۔
جہاں نور کا وہ جویا۔ منزل ناتمام کا وہ مسافر جو رات
کی تاریکی میں سماگیا تھا، صبح بھی نہ لوٹا۔
جس کے خوف سے موت کا فرشتہ ہمیشہ لرزہ براندام
رہتا ہے۔
وہ جو سمندر کی گہرائی میں، آسمان کی وسعت میں،
زندگی کے ہیجان میں، فضا کی ہر سمت میں موت سے نبرد آزما
رہتا ہے۔
وہ جو تحت الثریٰ میں گوہرِ شب چراغ کی تلاش میں
جا پہنچتا ہے۔
وہ جسے ڈس کر ناگ خود زہر مار ہو جاتے ہیں۔
وہ جس نے بادل کی بیٹیوں کو کنیز بنا رکھا ہے، جو بجلی کو
اپنی مٹھی میں پکڑے رکھتا ہے۔
وہ جس کی فرماں برداری طوفان کیا کرتے ہیں۔
میں اسی کے آستانے پر سر جھکاتا ہوں اور اُسی کے گیت
گاتا ہوں۔
میں اُس کا ثنا خواں ہوں اُس کا حمد گو ہوں
پھانسی کی رسی جس کے گلو گیر ہوتی ہے۔

جس کے خون سے شفق سُرخی حاصل کرتی ہو قید خانے میں
جس کی خدمت کے لیے آزادی کی دیوی آتی ہو۔
میں اسی کے گیت گاتا ہوں۔

دوسرا دَور

یادِ ایّام

یادِ ایّام

میرے محبوب!
تجھے میں نے پہچانا بھی تو کب۔
جب میرا مقصدِ حیات صرف یہ رہ گیا ہے کہ دھول ناگن کی طرح اپنی آنکھوں میں خاک جھونک کر دن رات ایک خونیں دائرے میں رقص کرتا پھروں۔
اور اب محسوس ہوا کہ میں تو تجھے روزِ ازل سے جانتا ہوں۔
تیرے گلے میں مچلتی اور زبان پر تھرّاتی ہوئی اس راگنی کو ان غلافی آنکھوں کو، اس آئینہ جبیں کو،
اس جمال جہاں آرا کو، راج ہنس کو شرمانے والی اس لغزش مستانہ کو،
ہر ادا کو میں پہچانتا ہوں، ہاں خوب جانتا ہوں۔
اسی لیے زندگی کے بے آب اور آتشیں سرچشمہ میں تیرتی ہوئی یہ جان حزیں پیہم تجھے پکارہ اٹھتی ہے۔
مری فریاد کی صرف ایک لَے ہے۔ میں تجھے جانتا ہوں، میں تجھے پہچانتا ہوں۔
نہ تو اقلیم محبّت کی ملکہ تھی نہ گداگر۔
تو پریم مندر کی جوگن اور پجارن تھی اور بس۔
مجھ سنگ دل پر تونے کس کس طرح عشق کے نقش بنائے تھے۔

خود کو جلاکر میرے سیہ خانۂ دل میں محبت کی لو بھڑکائی تھی۔ اپنی پوجا کے پھولوں سے اس بے برگ و ثمر پیڑ کو ہرا بھرا کر دیا تھا۔

زندگی کی صبح و شام میں اور حیات و ممات کی اُلجھنوں میں میں نے تجھے دیکھا ہے۔

مگر تو مجھ سے جدا ہوگئی ہے۔ ایک اجنبی دیس میں مجھے بے چارگی و تنہائی کے عالم میں چھوڑ کر تو رخصت ہوچکی ہے۔

جب شفق آفتاب سے محروم آسمان کے خونِ تمنا کو نمایاں کرتی ہے

تو میرے آنسو بھولے ہوئے افسانوں کو از سرِ نو زندہ کرتے ہیں

وہ دن یاد آتا ہے جب بہار خزاں کی طرف حسرت و یاس سے تک رہی تھی اور وہ رنگینیوں میں شرابور مبارک رات میرے گھر آئی تھی جب میری آنکھیں تیرے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں ڈوب گئی تھیں۔

اس وقت میں جوانی کے در پر ٹھٹکا ہوا کھڑا تھا۔

لڑکپن کی نیم باز آنکھیں شباب کے پیے جگا رہی تھیں۔

جوانی کی حرماں نصیبی شفق کی لالی کی طرح اپنا رنگ رچ رہی تھی۔ دُور سے آئی ہوئی نغمہ کی صدا میں ڈوب جانے والی ہنسی کی طرح جوانی کی سرمستیوں میں میری معصومیت معدوم ہو رہی تھی گم کردہ راہ بادِ سموم کی مانند میں راہ بھٹک کر گس

پردیس میں آپھنسا۔
اب میں ہوں اور وہ اشک ہائے درد آشنا جو کسی غریب الوطن کے غم گسار ہوتے ہیں۔
صبح سویرے جب میں نیند سے بیدار ہوا تو تو میری طرف دیکھ کر کس دل سوز انداز میں مسکرائی تھی۔
اور اس تبسم میں میرے آنسوؤں نے جھک کر پوچھا تھا کہ تیرا آشیانہ کہاں ہے؟ کس نے تجھے اسیر بنا رکھا ہے؟
تیری نگاہیں کتنی نازک تھیں۔ میں تو سمجھا کہ میرے نغمۂ فراق میں تو ہی سوز و گداز بن کر اُتر آئی ہے
جیسے باد بہار کی نفیر سے کلیاں چٹک جاتی ہیں اور ہرنیاں راہ بھول جاتی ہیں۔
پھر آدھی رات آئی اور تو رخصت ہونے لگی تو میں نے وہ ترانہ الاپا جس کے سرگم آنسوؤں میں گندھے ہوئے تھے اور جس میں میری بے قراری مچل رہی تھی۔ کہہ نہیں سکتا کہ ان گیتوں کی روشنی میں میں کسے اپنے خانۂ دل میں تلاش کر رہا تھا — وہ دل جس میں ہمیشہ تاریکی اور ویرانی چھائی رہتی تھی۔
اتنا یاد ہے کہ کچی نیند سے جاگی ہوئی تیری مخمور چشم کے گلابی ڈوروں میں میری پلکیں جھپک رہی تھیں۔
یہ بھی یاد ہے کہ ان پلکوں میں حیرت و مسرت نے نمی پیدا کردی تھی گویا یہ درد فرقت کی گھلاوٹ تھی۔
جب تو میرے حالِ زار پر ترس کھا کر کانپ اُٹھتی تو محسوس

ہوتا کہ لیلائے شب نے کسی کا سوگ لیا ہے۔

جانِ جاں! تیری آنکھوں میں محبت اور ہمدردی نے جو جوت جگائی تھی اس میں میری پیاسی آنکھیں کتنی پیاری معلوم ہو رہی تھیں۔

جب میں نے ہنسی ہنسی میں تجھے پکارا تھا تو نہ معلوم کیوں تیرے غرورِ عشق کو ٹھیس لگی اور آنکھوں کی کشتی جذبات کے تلاطم میں بہ نکلی

اور ساحل رخسار دم بھر میں آب آلودہ ہوگیا۔

میری پجارن بتلا تو سہی ایک ذراسی چھیڑ اور یہ محشرِ جذبات! میری خاطر یہ عزّ و ناز کیوں کہ تیرا کھلایا ہوا چہرہ فرطِ شرم سے اور ننھا سا دل وارفتگیٔ شوق سے تصویرِ درد بن گیا۔

میری آواز کو سنتے ہی تیرے آنسو ان خواب آگیں دریچوں سے کیوں جھانکنے لگے؟

میں اس نا معلوم راستے کا اجنبی مسافر تھا۔ تیری معصوم آنکھیں میری جدائی کے صدمے سے کیوں اشک فشاں ہوگئیں؟

مجھے دیکھ کر تو سب لوگ ہنسا کرتے تھے۔

بددعاؤں کے اثر سے میری سانس اتنی گرم ہوگئی تھی کہ اس سے آشیانے جل کر خس و خاشاک ہوجاتے تھے۔

میری مسکراہٹ کو سانپ کا من سمجھ کر لوگ جب اٹھانا چاہتے تو وہ زہر آمیز پھن بن کر انھیں ڈس لیتی تھی۔

دنیا جس سے ڈر کر گھبرا کر دور بھاگتی تھی اس بدبخت کو تونے کیوں گلے کا ہار بنالیا۔

اور پھر اسی وحشت زدہ کے لیے تو کیوں سینہ فگار ہو رہی ہے۔
کیا تجھے اور کوئی پیار نہیں کرتا؟ اور کوئی تیرا ناز بردار
نہیں بنتا؟ کیا تو اوائل زندگی سے جوگن ہے؟
یہی ہے ورنہ آنسوؤں کا یہ دریا اور کسی کو کب میسّر!۔۔۔۔
نہیں یہ نہیں ہے دل کے اندر سے کوئی کہتا ہے کہ یہ نہیں
ہوسکتا۔
بارہا طالبانِ دید کو محروم تماشہ دیکھا ہے پھر بھی تو
تشنۂ محبّت تھی اور تشنۂ محبت رہی۔
مگر صرف مجھے ہی شراب عشق سے سرشار کرنے کے لیے تو
کیوں بضد تھی؟
میری رانی یہ راز نہ تجھے معلوم ہے اور نہ مجھے، صرف عشق
کو اور دل کو اس بھید کا پتا ہوسکتا ہے کہ یاس و حسرت بلاسبب
رگ رگ میں کس طرح طاری ہو گئے ہیں۔
تجھے نہ جانتے ہوئے بھی اس روز محسوس ہوا کہ میں تجھے
ہمیشہ سے پہچانتا آیا ہوں۔
تو وہ "لینا" ہے جو جنگل میں بھٹکنے کے لیے اکیلی چھوڑ دی گئی تھی
تو وہ ہے جس کی آرتی کی تھالی ہمیشہ ٹھکرا دی گئی
جس کی مالا ہمیشہ ہنسی ہنسی میں مسل دی گئی۔
تو وہ دیوی ہے جسے دنیا میں دھنسنے کی بد دعا دی گئی تھی۔
تو خاموشی سے ان کلفتوں کو برداشت کرتی رہی۔
پہلی ہی نظر میں تو سمجھ گئی کہ تو مجسمۂ شباب ہے اور میں شعرِ مجسم۔

پھر ـــــ پچھلے پہر میری روح تیرے نغموں میں مرتعش ہوئی تھی۔ ان گیتوں میں جو لاج کے مارے تھرّا رہے تھے۔

نہ جانے کیوں ان الفاظ کے معنے میرے لیے صرف اس جملہ میں سمٹ آئے تھے۔ تو مجھے جانتا ہے، روزِ ازل سے پہچانتا ہے۔

متھرا پہنچ کر جب شیام رادھا کو بھول گیا تو شاید وہ اس کی یاد میں یہی گیت گنگنایا کرتی تھی۔

نل جب دمن کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر چلا آیا تھا تو شاید وہ بھی انھیں محشر انگیز سُروں میں اس کی یاد کیا کرتی تھی۔

جنگلی پھولوں کے ہار گوندھتے ہوئے جب شکنتلا کو پیتم یاد آتا تھا تو وہ بھی یہی یاس آفریں گیت گایا کرتی تھی۔

پہاڑوں اور بیابانوں کی خاک چھانتے ہوئے مہادیو کی یاد میں پاربتی نے یہی نغمہ چھیڑا تھا۔

ہاں مجھے سب کچھ یاد ہے۔

لیکن اس وقت شباب محو خواب تھا، تجھے دل نشیں نہ کر سکا صرف تیری نغمہ آفرینی کو روح میں بسا کر میں دور دراز کے سفر پہ چلا گیا۔

دوسرے ہی دن گومتی کے نشاط افزا کناروں پر دل میں چھپی ہوئی تیری یاد نے مجھے ختن کے اس آہو کی طرح تڑپا دیا جو اپنے سینے میں نافۂ مشک رکھ کر اس کی تلاش اپنے آس پاس کرتا ہے۔

میں ڈھونڈتا پھرا کہ کس کی یاد مجھے یوں محروم قرار رکھتی ہے۔

یہاں تک کہ میرے واویلوں نے زمین و آسمان کو فراق آشنا بنادیا۔
پھول پتیاں، ندی اور پہاڑ سب میرے ہم زبان ہوکر بھاگ
کے گیت گانے لگے۔
ساتھ ہی میرا ہٹیا نصیب آتش شباب میں تپ کر میرے دل کی
گہرائیوں میں پیاس سے بے تاب ہوا تھا۔
یہ جانِ حزیں جو منزلِ مقصود سے ناآشنا تھی چیخ چیخ اُٹھی کہ
کون سا ہے وہ دیس جہاں پیار کا مول لگتا ہے؟
زندگی اُداس سی رہتی تھی، دل ڈوبا ڈوبا سا رہتا تھا۔
میں سوچتا تھا جوانی کا زمانہ ایک طویل آہ کے سوا کچھ نہیں۔
آنکھوں کے آگے ہمیشہ دھوپ چھاؤں کے پردے لٹکتے
رہتے تھے۔
یہ نکہت یاد کہاں سے آکر میری روح میں سمائی جا
رہی تھی۔
میرا دل آہوئے رمیدہ کی طرح آپ اپنے سینے میں پوشیدہ
مُشک کی تلاش میں حیران و سرگرداں تھا۔
یہ خودی کا عشق کتنا عجیب و غریب تھا! اپنی محبت سے
اپنی تمنا کی خلش مٹانے کی کوشش کتنی حسرتناک تھی۔ میری جوانی
کی تشنہ لبی کی انتہا نہیں۔ محبت کے دریا اُس کی بوند کی مانند اس
کے ہونٹوں تک آتے آتے خشک ہوجاتے ہیں۔ الٰہی اس پیاس
کی کوئی حد بھی ہے!
کیسے بجھے؟ یہ پیاس کیسے بجھے؟ کہاں ہے وہ ناپیدا کنار

دریائے عشق جو اس آگ کو ٹھنڈا کر دے۔

مجھ لاأبالی رندِ لم یزلی کی تشنگی کو کون بجھا سکتا ہے!

وہ کہاں ہے جسے کھو کر یہ ساری دنیا میرے لیے ہیچ ہے۔ جہاں سکون میرے لیے حرام ہو گیا ہے۔

کچھ دور اور چل کر دیکھوں۔ اس رستے سے کئی مستانہ خرام دوشیزائیں گزرتی ہیں۔ ان کے پیچھے یہ پریم پیاسا دل اندھوں کی طرح دوڑنے لگتا ہے اور اگر کوئی ایک نگاہِ غلط انداز ڈال جاتی ہے تو خود داری کے احساس سے آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں۔

یہ دیکھ کر وہ مجھ پر ہنستی ہوئی چلی جاتی ہے۔ کوئی دروازے پر آ کر پوچھتی ہے، بھیک لے گا؟

یہ سُن کر دلِ بے مایہ رو رو اُٹھتا ہے۔ درد و غرور سے میرے قیامت خیز جذبات میں آگ سی لگ جاتی ہے۔

اور جب وہ چنچل لڑکی لجائی چتونوں سے بھیک کا پیالہ میری طرف بڑھاتی ہے تو میں اسے ٹھکرا دیتا ہوں۔

وہ روتی ہوئی بھاگ جاتی ہے اور خوف کے مارے میرے پاس کوئی نہیں آتا۔

"گو تم" کی یہ جانِ عزیز کشکول گدائی لیے محبت کی بھیک مانگنے در در صدا لگاتی پھرتی ہے۔

میری آواز سُن کر کتنے آتے ہیں کتنے حیرت و تردد لے کر لوٹ جاتے ہیں۔

کسی کے دل میں ٹھیس لگتی ہے، کسی کی آنکھیں چھلک

جاتی ہیں

میں بھیک میں مایۂ حیات مانگتا ہوں پھر بھلا یہ دُنیا دار

میرے سوال کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

پہلے تو تمسخر اُڑاتے ہیں اور پھر خود بھی پشیمان ہوکر روتے

ہوئے لوٹ جاتے ہیں۔

پوچھتے ہیں مسافر کہہ تو سہی تو چاہتا کیا ہے؟ تیری آواز

میں کس کی آتشِ تمنّا سلگ رہی ہے؟ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا

کوئی تن من لاتا ہے، کوئی متاعِ حسن، کوئی دولتِ جمال۔

کوئی مغرور راج کماری دولت کے نشے میں چور ہوکر مجھ

پر جوانی کے منتر پھونکتی ہے۔

مگر ان سب کی طرف میں آنکھ اُٹھاکر بھی نہیں دیکھتا۔

مایوس ہوکر میں بادیہ پیمائی میں مصروف ہوجاتا ہوں۔

آہ! میری وہ پجارن کہاں ہے جو کہے کہ میرے مالک میں

تیری خاطر جوگن بنی تھی۔ کیا تو مجھے پیار نہ کرے گا؟ میرے

پاس محبت کے سوا کچھ نہیں کیا تو اس تحفے کو قبول نہ کرے گا۔

اس ریگستان میں آبلہ پائی سے کیا حاصل جہاں یہ پیاس

شدید تر ہوجاتی ہے۔

سراب صحرا بن کر کوئی آنکھوں کے آگے آتا اور پھر اوجھل

ہوجاتا ہے۔ صرف یہ ندا جرسِ کارواں بن کر کانوں میں آتی ہے۔

میرے مالک نہیں بھیک نہیں۔ تجھے چاہتی ہوں۔ میں

تجھے جانتی ہوں اور تو مجھے پہچانتا ہے۔

میں سمجھ نہ سکا کہ یہ میری ہی صدائے بازگشت ہے۔ نہ یہ دریا ہے اور نہ ساحل۔ یہ سرابِ صحرا کے سوا کچھ نہیں۔

میں جب تیری نگری میں آیا تو میری زندگی خون آلودہ اور کانٹوں سے چھدی ہوئی تھی۔

اس وقت تک مجھے خبر نہ تھی کہ میری چبھن میرے سینے میں پیوست ہو کر کسک بن جاتی ہے۔

تاہم محسوس ہوتا تھا کہ تیری مخمور کن قرابت میرے تمام مصائب کو دور کر دے گی۔

ہمدم! معلوم ہوتا ہے کہ میرے دل میں تیری یہ فریاد تڑپ رہی ہے۔ مسافر، یہ کانٹا مجھے نکالنے دے۔ بتا تو سہی کہ درد کہاں ہے اور کیوں ہے؟

بے زبانی تیری زبان تھی، خاموشی تیری گویائی تھی۔ آہ! تیرا نغمہ تھی۔ اس لیے یہ دلِ تنگ سب سُن کر بھی نہ سمجھ سکا کہ اس التجا میں ناکام محبت دادطلب ہے۔

اس کشمکش کے عالم میں جب اندھیری رات موسلا دھار بارش میں نہا رہی تھی، نہ جانے کہاں سے میری ماں آئی اور مجھے گود میں اُٹھا کر ان روتی ہوئی آنکھوں کو بار بار چوم لیا۔

پھر نہ وہ بے راہ روی رہی نہ وہ شورش طلبی۔ اس کے بوسوں نے آتشِ غم کو سرد کر دیا۔ ناکامی کی تیرگی میں ماں کی

ماما جگنو کی طرح جگمگا اُٹھی۔

ایک عرصۂ دراز کے بعد وہ آشفتہ مزاج خانہ زاد آوارہ گردی سے تھک کر گھر لوٹ آیا۔ اور اسے سکون ملا تو ماں کی شفقت میں۔ اس کے آوارہ ترانوں کی گونج شفقتِ مادری کی تیز ہواؤں میں گم ہوگئی۔

مگر ایک بار اور میں اپنے رستے سے بھٹکا:۔ جب یہ معلوم ہوا کہ ایک شوخ حسینہ میرے در کی زنجیر کھٹکھٹا رہی ہی تو مجھے یاد نہ رہا کہ اب تک میں کس کی تلاش میں کھویا ہوا تھا۔ یہ بھی بھول گیا کہ میں کس پوجا کے پھولوں کا طلبگار تھا۔ حسرت ویاس کا پتہ نہ رہا۔

گویا شادیٔ مرگ سے دل کے بند بند کھل گئے، بے اشک آنکھیں پھر آنسوؤں سے چمک اُٹھیں۔ کسی کی عطر بیزی سے روح مہک اُٹھی۔

فراق و وصل کی ہنگامہ خیزیوں میں زندگی بھنور میں پڑی ہوئی کشتی کی طرح ڈگمگانے لگی۔

ایک بار بچ کر یہ گل دیدہ بلبل پھر دامِ صیاد میں آپھنسا.... مندر کی مورت میرے خون میں ڈوب گئی تو بھی وہ پتھر کی مورت بے حس ہی رہی۔

یوں ذلیل ہوکر غرورِ عشق انتقام کی آگ میں کود پڑا اور میں اشہبِ بغاوت پر سوار ہوکر بادلوں کو چیرتا اور نعرے لگاتا ہوا

اس خدائے قہار کی طرف جھپٹ پڑا جو سارے مصایب و آلام کا خالق ہی۔

نقیبِ قیامت ستارۂ تخریب سُن کر میں نے اس عالم صحرائی میں جو آبِ محبت سے یکسر خالی ہی خون اور آگ کے دریا بہا دیے۔

لیکن یہ فریب ہستی! میرے محبوب! بیچ بیچ میں محسوس ہوتا تھا کہ تیری بانسری کہیں دور میرے نام کی رٹ لگائے ہوئے ہی۔

اس نامعلوم دور افتادہ منزل کی طرف دیکھتے ہوئے ان آنکھوں میں دردمندی کے آنسو تیرنے لگتے تھے جن کی پلکیں خون آلودہ تھیں

مجھے یقین ہوگیا کہ ایک تو ہی جنگل کی وہ شہزادی ہی جو میرے لیے پھول چُنا کرتی ہی اور بڑے جتن سے ایک ہار بناکر اپنے پاس رکھ چھوڑتی ہی۔ میری بھکارن! معلوم نہیں شرم و حیا کے بھولپن میں کتنی مدت سے تیری صحبت کا سدا بہار پھول کھلا ہوا ہی۔

دل کے اندر موجیں مارتا ہوا دریائے اندوہ کھلکھلاکر کہتا ہی۔ "پہچان گیا۔ جسم مردہ میں پھر سے جان پڑگئی"۔ یہ آواز تو اس کی ہی جس کے بغیر اس وسیع دنیا میں مجھے کہیں سکون میسر نہ تھا۔

مگر ساتھ ساتھ نالہ و شیون کی یہ روح فرسا صدا کیسی؟ جیسے کوئی پیچھے سے پُکار کر کہتا ہو دوست! ابھی وقت نہیں آیا۔ تو بھی میں نے سُنی ان سُنی کردی۔ چشم زدن میں بجلیوں پر بیٹھ کر تیری رگِ جاں سے بھی قریب آگیا۔

نہ معلوم وہ راہِ فنا، وہ خونیں پرچم، وہ آتشیں رتھ کیا ہوئے اتنا یاد ہی کہ تیرے آغوش میں سکون و اطمینان کے پھول بکھرے ہوئے تھے۔

اس کے بعد میں جو کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے الفاظ نہیں ملتے
اب نہ دل میں دھڑکن باقی ہے نہ آنکھوں میں آنسو اور نہ امید میں تقویت۔
اب جو کچھ کہوں گا وہ گیت نہ ہوگا۔ یہ وہ نوحہ ہے جسے خونِ دل ناکامی کی زبان میں بیان کر رہا ہے۔
تم سوچتی ہوگی کہ اس کنگال کی بے حیائی کی بھی کچھ انتہا ہے کہ شرف و عزّت کا متمنی رہتا ہے۔
در اصل یہ حقیقت کتنی حیرت انگیز ہے! اب میں بھی ان باتوں کے تصور سے ہنس دیتا ہوں۔
مگر میرے محبوب نہ بھول کہ در در کی خاک چھان کر میں تھکا ہارا تیرے پاس آیا تھا۔ سچّے پیار کی جو تھوڑی بہت کائنات رہ گئی تھی اس کا ہدیہ میں نے ڈرتے ڈرتے تیرے سامنے پیش کیا تھا۔ اے ستمگر! کس ذوق و شوق سے میں نے اپنی کم مائیگی کے احساس کے باوجود تیری پوجا کے سامان کیے تھے۔
سوچا تھا کہ جس بار کو یہ ہوس ناک دنیا نہ اٹھا سکی اسے تو خوشی سے سنبھال لے گی۔ اس ازلی باغی کو تو پابند محبّت بنالے گی سوچا تھا کہ اس سرکش و خودسر پر فتح پاکر تیرا عشق روشن ہوجائے گا۔ بعد ازاں میرے ناتواں بازوؤں میں تیرا خلوص وہ زور پیدا کردے گا کہ میں نعرۂ بغاوت بن جاؤں گا اور تو بغاوت کی بجلی۔
دل میں یہ آرزو تھی اور اس کی تکمیل کی یہاں تک

جرأت تھی کہ میں دنیا کی ساری رنگینیوں کو تجھ پر نثار کر سکتا تھا۔

لیکن آہ! نہ وہ جوش ہے نہ وہ ولولے نہ وہ خلش و تپش!

یکا یک تو زمانے کی طرح بدل گئی۔ عجب کہ تو بھی کر و فریب کے دام میرے لیے بچھانے لگی۔

میرا سینہ ہمیشہ سے حقیقت سے منور رہتا ہی۔ اس کی دوبیں نگاہیں خون کی ایک ایک بوند کو پرکھ سکتی ہیں۔

تیری پوجا کو جس لالچ نے آج گناہ آلودہ کر دیا، کیا وہ مجھ سے چھپی ہوئی ہی؟ آج تو اسے بھولنے کی کوشش کر رہی ہی کل تک تو نے دل و جان جس کے سپرد کر رکھا تھا۔

میں حیران ہوں کہ تیرے شفاف دل پر گناہ کی لکیر کس نے کھینچ دی۔ کیا یہ ممکن ہی کہ تو بھی فریب دینا سیکھ جائے۔

اگر یہ سچ ہی کہ تو کوئی فریب خوردہ نہیں تو کیوں نہ اس جھوٹی دنیا میں آگ لگا دی جائے!

میں اور تو، چاند اور سورج، ارض و سما سب فریبِ زندگی کے شکار ہیں۔

جلا دے ای بیدادگر اس جھوٹی دنیا کو اپنی عشرہ طرازی سے جھلسا دے۔

آج جو میں تیری طرف نظر اٹھاتا ہوں تو خود داری بجلی بن بن کر دل کے آسمان میں کوندنے لگتی ہی۔ تیری بیوفائی اور اپنی بے حیائی کا احساس سوہان روح بن جاتا ہی۔ جی چاہتا ہی کہ

زمین شق ہو جائے اور اپنی اس حسرت نصیب اولاد کو اپنے دامن میں سمیٹ لے۔

جب کبھی امید کی ایک آدھ کرن چمکتی ہے تو اس کی طرف دیکھتے ہی سارے حوصلے پست پڑ جاتے ہیں۔

ہائے! کہاں ہے وہ پجارن، وہ جوگن۔ کیا یہی ہے درو، تندخو وہ پیکرِ عصمت ہے؟

میری زندگی کو اس نے کھلونا کیوں سمجھ لیا؟ میرے ارمانوں کو اس کج ادائی سے وہ کیوں کچل رہی ہے؟

ان بتوں کے آگے وفا شعاری کی کوئی قیمت نہیں۔ عورت کی ہوس کی انتہا نہیں۔ ایک کی پرستش اسے مطمئن نہیں کرسکتی۔ وہ ہمیشہ بہت سے چاہنے والوں کی جویا رہتی ہے۔ جس کے لیے میں خدا کی عبادت سے منحرف ہو گیا آج وہی یوں مجھے قعرِ مذلت میں گرا رہی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا۔ کیوں نہ اب میں موت در آغوش طوفان کا ہم سفر بن جاؤں۔ راستوں میں کس کی یاد میں فریاد کرتا پھروں؟

کیوں نہ اس بار آتش فشاں پہاڑ اپنے غارت گر دہانے کھول دیں؟ کیوں نہ میری گرم گفتاری بغاوت کے جھنڈے لہرا دے اور موت کے فرشتے میرے ہم سخن بن جائیں؟

لے آؤ اپنے آتشیں رتھ اور پھونک دو ہنگامِ قیامت کے

صور۔ نکالو زہر و آتش میں بجھے ہوئے تیر۔ برباد کردو اس دنیائے معصیت کو۔ ٹپکادو یہ خونیں شراب عزرائیل کے گلے میں تہ و بالا کردو اس عصیان کدہ کو اپنی ٹھوکروں سے!۔

درآں حالے کہ دلِ صد چاک میں غضب کی جلن ہے، تو بھی او ظالم! مجھ خوب یاد ہے کہ جب تک میں تجھے قابلِ اعتنا نہ سمجھتا تھا، جب تک میں محبت کی ابلہ فریبیوں سے ناواقف تھا تب تک تو حریم محبت کی گداگر تھی۔ سہاگ کے دو چار تنکے چننے کے لیے تو کس طرح میرے آستانے کی جبیں سائی کرتی تھی۔

میں تیری نظر فریبیوں سے بچا رہا۔ آج کیا تو اُسی کا انتقام لے رہی ہے۔ اب میں موت سے ہم آغوش ہو کر سسک رہا ہوں۔ بے درد! کیا میرا دل اسی لیے تھا کہ یوں چور چور کر دیا جائے۔

اس کرم کی نگاہ کے بعد اس کور چشمی کو میں کیوں کر برداشت کرسکتا ہوں۔

عورت! اگر مرد تیرے جذبات کی یوں تحقیر کرتا تو تو اسے کیا کیا دشنام نہ دیتی؟۔

سوچتا ہوں کہ کیا ہر معصوم دوشیزہ کا بوسہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ دل میں داغ بن کر رہ جائے۔

نہیں یہ نہیں ہے۔ نسیم کلی کے دل کو گدگدا کر پھول

کھلاتی ہی مگر صرف بھونرے کو معلوم ہوتا ہی کہ کیوں کر پھول کا دل چاک کیا جاتا ہی۔

جب بہار کا چل چلاؤ تھا میں آہستہ خرام باد بہاری کے ساتھ اس دیس کو چل دیا جہاں نہ حیات ہی نہ موت، ہمیشہ اندھیری رات کا سایہ رہتا ہی۔

اس دن کو یاد کرکے آج بھی میں لبریز مسرت ہوجاتا ہوں جب میں الوداع کہ رہا تھا اور آنکھیں فرط انبساط سے رونے لگی تھیں۔

میں جب تجھے پیار نہ کرسکا تھا، تو نے ہی پہلے پہل میرے ہونٹوں سے پریم پیالہ لگایا تھا۔

اب تک میرا بےتاب آغوش ان حیات آفریں سانسوں کی لپٹ کو محسوس کرتا ہی جو دوشیزگی کی دُنیا سے چلی تھی۔

اخلاص و محبت کی ان رنگینیوں سے یہ زندگی چمک اٹھی اس حد تک کہ اب میں موت میں کوئی تلخی محسوس نہیں کرتا۔

جب اپنے موت درکنارہ ہونٹوں پر تیرے حسین و جبین بوسوں کی لرزش محسوس کرتا ہوں تو جی چاہتا ہی کہ تیرے نام کو ہزار بوسے دوں۔

میرے محبوب! ایک آرزو یہی ہی کہ جب کبھی جُدائی کی راتیں کسی دوسرے کے لیے راحت کا پیام لے کر آئیں اور تو اپنے

فرقت زدہ دل میں کھٹک سی پائے تو کوئی مجھے بتادے کہ وہ دُکھیارا اب اس دنیا سے سِدھار گیا۔

کبھی یہ نہ ہوگا کہ تیرے بوسے کی گرمی کا تصور ایسے ندی نالوں کو پار کرتا یہاں تک لے آئے گا۔

وہ رشک و حسد کا پُتلا، وہ غرض و نفس کا بندہ تو مرگیا اور لازوال بنا گیا اسے جو جدائی اور ناکامی میں محبت کا راز داں ہوکر شاعر بن گیا۔

دریا کا گیت

معلوم نہیں میں کس منزل کی طرف جا رہا ہوں۔
اس بحر بیکراں میں خوشی اور غم کی موجیں تھپیڑے مار رہی ہیں اور میری زندگی کی کشتی ان ہی موجوں میں ڈانواں ڈول ہو رہی ہے۔ آفرینش کی سوت سے نکل کر آپ اپنی روانی میں بہا جا رہا ہوں اور یہ راہ بے منزل کبھی فتح نہیں ہوتی۔ شب و روز صحرا نوردی میں مشغول ہوں کہ ازلی غریب الوطن ہوں۔ دنیا میں آتے ہی مسافر بنا اور دشت و جبل کی خاک چھانتا پھرا حتیٰ کہ کبھی وطن کی خاکِ پاک کو بوسہ نہ دے سکا۔
میں آسمان کے آغوش سے مثل برف مچل کر نکل آیا، کبھی یہاں تڑپا، کبھی وہاں چمکا۔

بانسری کی لے سن کر ننھا سا ہرن اپنی ماں کی ممتا بھلا کر جس راہ پر چل نکلتا ہے،
جھرنے کے دائمی ترانے سننے کو خرگوش جس سمت بھاگتا رہتا ہے، بلبل جس نوا کو سن کر دیوانہ وار اپنے نازک پر کھولنے لگتا ہے، بادل جس پکار کو سن کر سمندر کی الفت کو فراموش کر کے آسمان کی طرف لپکتا ہے۔
بس! اسی ندا کو سن کر اسی راستے پر میں بھی چل

بکھرا ہوا ہوں۔ جنگل، پہاڑ، آبادی اور ویرانے پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر میں اسی منزلِ ناتمام کی طرف بھاگ رہا ہوں۔ میں بھی گویا شہابِ ثاقب ہوں۔ ستاروں کی محفل تک پہنچنے کا زینہ ہوں۔

نہ معلوم میں کہاں جا رہا ہوں۔ انسان میرے کنارے گھروندے بنا کر سمجھتا ہی کہ یہ میری موجوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ دوشیزاؤں کے گروہ میرا پانی صراحیوں میں بھر کر لے جاتے ہیں۔ اور میرے سینے کے اندر چپوؤں کی کمند ڈال کر میرے جذبات کی لہروں میں ہیجان پیدا کر دیتے ہیں۔ انھوں نے صرف میرے پانی کی شیرینی کو چکھا ہی۔ یہ نہیں دیکھا کہ میرے ساحل کے دونوں طرف مرگھٹ کی آگ سلگ رہی ہی جس میں ارمانوں کے لاشے خاک سیاہ ہو رہے ہیں۔

مجھ بد نصیب کو اب تک نہ معلوم تھا کہ زندگی کا جوہر اس کی روانی میں پوشیدہ ہی۔

میرے کنارے کے ہر گھاٹ پر گھنگرو کی جھنکار سنائی دیتی ہی اور حسینوں کا خرامِ نازنہ لہروں کے گیت سے گت ملا کر فضا کو مترنم کر دیتا ہی۔

گڈریا ساحل کے پاس ایک درخت کے سایہ میں بیٹھا بانسری کی تان اُڑا رہا ہی۔ چاند آسمان پر جلوہ افروز ہو کر میری آرسی میں اپنا مُنہ دیکھتا ہی۔ میں سمجھتا ہوں —— خوب سمجھتا ہوں کہ میرے دونوں کناروں پر فریب حسن کا جال بچھا کر

وہ میرے دل بیقرار کو مسحور کر لینا چاہتا ہے۔

ادھر دیہات کی کچھ کافر اداؤں کا اصرار ہے" اک ذری ٹھہر تو جانا! ہم ایک لہر کاٹ لیں!"

میں جا رہا ہوں! —— عدم کی طرف یا دوام کی طرف؟۔ کیا معلوم!۔

بس اتنا دیکھتا ہوں کہ کہیں کہیں حسینوں کے غول میرے ساحل پر جمع ہو کر دل نشیں نغمے چھیڑ دیتے ہیں کہیں کوئی حسن کی دیوی بناؤ سنگھار کیے ناؤ پر بیٹھی بیٹھی ہے جس کی پتوار سے مجھے ایسے ٹھوکے دیے جاتے ہیں کہ لہروں کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے اور ان نادان لہروں کو دیکھو۔ کس ایمانِ راسخ سے میرے قدموں کو چوم رہی ہیں۔

افسوس میری گردشِ رفتار اور انتشارِ قلب کا احساس انھیں نہیں ہے۔

آدھی رات کے وقت کام دیوتا کی پجارن سب کی آنکھیں بچا کر میرے ساحل پر پناہ گزیں ہوتی ہے۔ میری لہریں ایک دوسرے کو کہنی مار کر کھلکھلا کر کہتی ہیں! "ہم پہچان گئے! اری جوگن تو گھر بار چھوڑ کر ندی کی عمیق گہرائیوں میں سکون ڈھونڈنے آئی ہے"۔ دنیا سے منہ موڑ کر کسی بے وفا کی تلاش میں وہ میرے پاس آئی تھی اور وہ دیکھو اسے اپنے دامن میں سمیٹ کر میں پھر اپنی راہ پر روانہ ہو جاتا ہوں۔

ماضی کا افسانہ ریت پر لکھا جاتا ہے جسے مستقبل آنِ واحد میں حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتا ہے۔

جانے وہ کون سی کشش ہے جو مدعا اور مقصود سے بے نیاز بنا کر مجھے یوں کھینچے لیے جاتی ہے اور راہ جتنی طے ہوتی جاتی ہے منزل بھی اتنی ہی دور تر ہوتی جاتی ہے۔

تاہم میں پیچھے لوٹ کر نہیں دیکھتا اور لہروں کا ترنم مسلسل یہی کہے جاتا ہے کہ ـــــ "چل چل، چل چل"

شام کو گھنبے کے سب لوگ واپس ہو جاتے ہیں اور اپنی یاد دلانے کے لیے مرگھٹ میں کچھ مجھے مرجھائے ہوئے پھول چھوڑ جاتے ہیں اور آہ! میں اپنے ساحل پر جلنے والی لاش کی خبر گیری کے لیے تن تنہا رہ جاتا ہوں۔

درد جو چٹکیاں لیتا ہے تو سینے سے بے اختیار شیون کی صدا بلند ہوتی ہے مگر اس خاموش فریاد کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

ارے نادان! چل، جلدی چل۔ اب تک تو نہ سمجھا تھا کہ تجھ میں جو گندگی حلول کر گئی ہے، وہی تجھے مضطرب کیے ہوتے ہے۔ آنسوؤں کی بوندیں اسے پاک کر دیں گی۔ اے مسافر وہ دیکھ سمندر تیرا منتظر ہے جسے آنسوؤں کی بوندوں نے وہ وسعت بخشی ہے کہ وہ آسمان سے ہم آغوش ہے۔

مجھے یاد کروگی

مجھے یاد کروگی ـــــ اُس دن جب میں اس سرائے فانی میں

نہ ملوں گا۔

ستارۂ شام سے میرا پتہ پوچھوگی اور میری تصویر کو دل میں

چھپاکر پُرشور دریاؤں، دہکتے ہوئے ریگستانوں، فلک بوس پہاڑوں

اور گاتی ہوئی ہواؤں میں مجھے ڈھونڈتی پھروگی۔

مجھے یاد کروگی ـــــ اُسی وقت جب چونک کر خواب سے

جاگ اُٹھوگی اور کسی کا جانا پہچانا سایہ تمھارے دھڑکتے ہوئے

قلب پر تھرتھرائے گا۔ تم سمجھوگی کہ میں ہی تمھاری آغوش میں

آلیٹا ہوں۔ لیکن جب سُونے بستر اور خوابِ رنگیں کی یاد کے سوا

کچھ نہ ملے گا تو دردِ دل آنسو بن کر آنکھوں میں چھلک آئے گا۔

مجھے یاد کروگی ـــــ اُسی وقت جب تمھارے رباب کے

تار یکایک ٹوٹ جائیں گے اور سب یہ کہہ اُٹھیں گے کہ یہ تو اُسی

سیہ بخت کا سکھایا ہوا گیت ہے۔ پھر تم ان دل ربا صحبتوں کو یاد

کروگی۔ اور رباب خود بخود بروگ کے گیت گانے لگے گا۔ تم لاکھ

ضبط کرو لیکن دلِ بیتاب آنکھوں کے پیالے کو اُچھال ہی دے گا۔

مجھے یاد کروگی ـــــ جب جنبیلی کے پھول تمھارے آنگن

میں ایک ردائے سپید بچھادیں گے۔

ان کا گجرا بنانے بیٹھوگی تو یکایک تمھاری چوڑیوں میں ارتعاش

پیدا ہوگا اور مرجھائی ہوئی کلیاں چپکے چپکے رونے لگیں گی۔

تمھیں محسوس ہوگا کہ میرے مزار کا ایک ایک ذرّہ نالہ کُناں ہے اور آشفتہ برگِ گُل شبنم سے اُس کی آب پاشی کر رہے ہیں۔

مجھے یاد کروگی — جب تمھارا تصوّر آتشِ فرقت کی ڈور میں آنسوؤں کی مالا گوندھ کر تمھارے تبسّم کی نذر کے لیے لائے گا۔

مجھے یاد کروگی — جب ساون کی مدہوش ہوائیں جوانی کے ولولوں سے سرگوشیاں کریں گی۔ وہی زمین ہوگی اور وہی آسمان۔ صرف منزلِ ہوس کا وہ مسافر نہ ہوگا۔ اپنے سیمیں بازوؤں میں آپ اپنے کو لپیٹ کر تم اس شوریدہ سر کے بوسوں سے لذّت اندوز ہونے کی سعیٔ لاحاصل کروگی اور جب سیج کا سُونا پن دل میں ایک میٹھی سی ٹیس دے گا تو مجھے یاد کروگی۔

مجھے یاد کروگی — جب گنگا کی نہنگ آسا موجیں ناؤ سے اٹکھیلیاں کرنے لگیں گی۔ تمھیں وہ رات یاد آئے گی جب ہم دونوں اس ناؤ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کناروں پر تاریکی تھی اور بیچ دریا میں محبّت کا چراغ روشن تھا۔

مجھے یاد کروگی — جب آسمان سہانی چاندنی سے دُرفشاں ہو جائے گا اور مہ و انجم کے سرگم میں میرے گیت کی صدائیں گونجیں گی۔ تمھاری ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں آسمان میں اس ستارے کی تلاش کریں گی جو میری ہی طرح پُر حسرت اور درد مند تھا۔

مجھے یاد کروگی — جب ہیبت ناک طوفان رقص کرے گا۔ موسلا دھار برکھا دُنیا کو جل تھل کر دے گی اور تمھاری کٹیا لرزنے لگے گی۔ کوندے کی لپک کے ساتھ تم دہشت سے چیخ اُٹھوگی اور ان بازوؤں کو یاد کروگی جو اس ڈراؤنی شب میں تمھیں عافیت بخش سکتے تھے۔ اسے یاد کروگی جس کا گرم بوسہ تمھارے قلبِ مضطر کو گرما دیتا تھا۔

تیسرا دور

اشتراکیت

اشتراکی

میں اس مساوات کے گیت گاتا ہوں جہاں پہنچ کر سب اختلافات اور تفرقے مٹ جاتے ہیں۔

جس کے سایئے میں ہندو اور بودھ، مسلمان اور عیسائی ہمدوش ہو جاتے ہیں۔

میں اسی مساوات کا نغمہ سنج ہوں۔ تم کیا ہو؟۔ پارسی، جینی یا یہودی۔ بولو تو سہی کیا ہو؟

تم جو بھی ہو تمھاری مرضی ہے۔

پیٹھ پر تم خواہ کتنی ہی کتابوں کا بار لادے پھرو۔

قران، پران، انجیل، وید، تمھارا جی چاہے تو گھول کر پی جاؤ۔
لیکن یہ تو کہو اس دردِ سر سے مدعا کیا؟ ان کاغذی پھولوں پر جان کیوں دیے دیتے ہو۔ وہ دیکھو باغ جہاں میں چمن بندی ہو رہی ہے۔ سارے زمانے کے علم کو کھنگالنے والو! ذرا کتابِ دل کی طرف بھی تو ایک نظر دیکھ لو۔

تمھیں اپنے نفس میں دینِ حق کا چراغ جگمگاتا ملے گا۔ اور تمھارا دل وہ کعبہ ہے جو بنی نوعِ انسان کا قبلہ نما ہے۔

مُردہ دیوتاؤں اور فرسودہ کتابوں کی تلاش میں ناحق مارے مارے پھرتے ہو۔

تمھارا دل جو مشعلِ نور سے اس کور چشمی پر حقارت سے ہنستا ہے

بڑے بڑے تاج دار اسی دل کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں
وہی تیرتھ ہے۔ وہی کعبہ ہے۔ وہی کاشی ہے وہی یروشلم ہے۔
دیر و حرم، کعبہ و کلیسا، سب کچھ اسی دل میں ہے۔ عیسیٰؑ اور
موسیٰؑ نے اسی خانۂ دل میں بیٹھ کر حق کی جھلک دیکھی تھی۔
یہی وہ میدانِ جنگ ہے جہاں کرشن نے گیتا کا ورد کیا۔
اور اسی کوہ میں بیٹھ کر نبیوں نے حقیقت کی تھاہ پائی۔
یہی وہ کوہِ ندا ہے جہاں گوتم بودھ نے مظلوم انسانیت کی پکار
سُنی اور اس کی نجات کی خاطر راج پاٹ تج دیا۔
اسی دل کے مندر میں بیٹھ کر رسول عربی نے اپنا پیغام سنایا
ہمدم تو کس فریب میں مبتلا ہے۔
سچ جان کہ اس دل سے بڑی کوئی سجدہ گاہ نہیں ہے۔

خدا

تم آکاش پاتال اور دشت و جبل میں کس خدا کو ڈھونڈتے پھرتے ہو۔

درویشو صوفیو! تم نے بھی کمال کر دیا۔ دُنیا تمھارے مُنہ کو تک رہی ہے اور تم ہو کہ آنکھیں بند کیے بیٹھے ہو۔

خالق کی تلاش! یعنی تم آپ اپنی تلاش میں سرگرداں ہو۔

عقل کے اندھو! دل کی آنکھوں سے دیکھو تو آئینہ میں تمھیں اپنے چہرے کی ہر رگ پر اس کی صورت نظر آئے گی۔

یہ سُن کر آگ بگولا نہ ہو جاؤ۔ یہ نہ سمجھو کہ تم ہی اللہ میاں کے پرائیوٹ سکریٹری ہو۔

ہر شے میں اُس کا نور ہے اور ہر انسان سے وہ تناسا ہے۔

سوداگر ساحل پر بیٹھ کر موتیوں کا سودا کرتے ہیں لیکن انھیں سمندر کی تھاہ کیا معلوم۔ یہ موتی کو پرکھ سکتے ہیں لیکن سمندر کی گہرائی کی خبر انھیں کیا۔

اس سمندر میں یہ گہرے کبھی نہیں گئے۔

ہمدم! تو ان کتابوں کو چھوڑ اور دریائے حقیقت کے اندر بیٹھ کر دیکھ کہ کیا تماشا نظر آتا ہے۔

انسان

میں مساوات کے گیت گاتا ہوں۔
انسان سے بڑا کوئی نہیں ہے۔

ہر زمانے میں، ہر ملک میں، ہر نسل میں، جتنے انسان ہوتے ہیں ـــ سب ایک ہی رشتے میں منسلک ہیں۔ وہ سب انسانیت کے زُمرے میں شامل ہیں۔

پُجاری! دروازہ کھول! بھوک کا دیوتا دیر سے کھڑا ہوا ہے۔ اُٹھ کہ پوجا کا وقت ہوگیا۔

خواب میں یہ ندا سُن کر پُجاری چونک کر اُٹھ بیٹھا اور عبادت گاہ کا دروازہ کھول دیا۔ سوچا کہ دیوتا کا کرم ہو تو سب دِلدّر دور ہو جائیں۔

مسافر کے کپڑے تار تار تھے اور وہ بیدِ مجنوں کی طرح لاغر تھا۔ بھوک سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا "بابا سات دن کا بھوکا ہوں"

مگر جب دروازہ بند ہوگیا تو ہراساں بھکاری اندھیری رات میں جاڑے میں کانپتا ہوا وہیں گر پڑا۔ بھوک کی آگ میں وہ جلا جاتا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "دیوتا۔ یہ تیرا نہیں پُجاری کا مندر ہے"

کل مسجد میں کہیں سے کھانا آیا تھا۔ پلاؤ قورمہ کی رکابیوں

کو مُلاّ للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت ایک مسافر آیا جس کا جسم تکان سے چور چور ہو رہا تھا، بولا "بابا! کئی روز سے فاقہ کر رہا ہوں"

مُلاّ نے دیدے نکال کر کہا "مردود یہ تیرے گناہوں کی سزا ہے۔ کبھی نماز بھی پڑھتا ہے؟"

بھکاری نے کہا "جی نہیں" مُلاّ نے چیخ کر کہا "ملعون نکل خدا کے گھر سے" یہ کہہ کر مسجد میں اس نے قفل جڑ دیا۔

فقیر نے آہ بھر کر کہا "یا رب اسّی سال کی مدّت میں میں نے تجھے کبھی یاد نہیں کیا۔ تاہم میری روٹیوں پر تو نے پابندی نہیں لگائی۔ تیرے مندر و مسجد پر انسان کا کیا اختیار ہے؟ پنڈتوں اور ملّاؤں نے ان پر قبضہ کیوں کر رکھا ہے"

ہلاکو، چنگیز، غزنوی اور کالا پہاڑ کہاں ہیں؟ ان متقفّل عبادت گاہوں کو توڑ کر کیوں نہیں پھینک دیتے۔

خدا کے گھر پر کون تالا جڑتا ہے۔ کون زنجیر لگاتا ہے۔

لاؤ ہتوڑی اور کدال۔ مسمار کر دو ان سیہ خانوں کو۔

اے عبادت خانو! تمہارے میناروں پر چڑھ کر منافقت نفس پرستی کا پرچم اُڑاتی ہے۔

مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔

قرآن وید اور انجیل کو چوم چوم کر یہ کمبخت مرے جاتے ہیں یہ ناسمجھ کتابوں کی پرستش کرتے ہیں۔ کوئی انھیں بتلائے کہ

انسان کتابیں بناتا ہے۔ کتابیں انسان پیدا نہیں کرسکتیں۔ اور ان مردہ کتابوں کے صدقے میں زندہ انسان ایک دوسرے کا خون پی رہے ہیں۔

ہم سب کی رگوں میں مذہب کے بانیوں کا خون بہ رہا ہے۔ ہم انھیں کی اولاد ہیں۔ ہم بھی ان جیسے انسان ہیں۔ معلوم نہیں۔ ہم میں سے کون ان کے رتبے کو حاصل کرے۔

ہمدم، میرا مذاق نہ اُڑاؤ۔ "انا" کی عظمت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟

ممکن ہے کہ ہمیں میں کوئی کل جگی اوتار ہو، کوئی مہدی ہو، کوئی عیسیٰ ہو۔

پھر تو کس سے نفرت کرتا ہے۔ کس پر وار کرنا چاہتا ہے؟

ارے نادانو! اس کا سینہ بھی بیت اللہ ہوسکتا ہے۔

اگر وہ بیمار اور نحیف ہے، اگر نادار اور مفلس ہے تو کیا ہوا؟

دُنیا کے تمام عبادت خانے اس پیکرِ خاکی سے زیادہ مقدس نہیں ہو سکتے۔

ممکن ہے اس دکھیاری عورت کے بطن سے ایک ایسا انسان پیدا ہو جو تاریخ عالم میں اپنا ثانی نہ رکھتا ہو۔

جس بطلِ نور کو آج تک دنیا نے نہیں دیکھا،

جس ندا کو سُننے کے لیے زمانہ اب تک گوش برآواز ہے،

ممکن ہے کہ وہ اسی کی جھونپڑی کو نوازے۔

انھیں گورکن کہہ کر حقارت سے نہ ٹھکراؤ۔ ان کے اندر

نہ جانے کتنے ہرشچندر چھپے ہوئے ہیں۔ کل انھیں میں سے کوئی سربلند ہوا تو تم اسی کی آستاں بوسی کو اپنی معراج سمجھو گے۔

گوالا کہہ کر اسے کیوں نفرت سے دیکھتے ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں پھر کوئی کرشن پیدا ہو۔

کسان کے نام پر ناک بھوں کیوں چڑھاتے ہو۔ پوچھو تو وہی اس دُنیا کا سرتاج ہے۔

ان گڈریوں پر نہ ہنسو۔ انھیں میں ایک ایسا نبی پیدا ہوا جس کا پیام اب تک دنیا کو منور کر رہا ہے۔

تمھارے دروازے پر کوئی فاقہ زدہ آیا تھا۔ اسے تم نے دھکّے دے کر بھگا دیا۔ تم کیا جانو کہ اس بھیس میں کون دیوتا تمھارا امتحان لے رہا تھا۔

ہمدم تیرے سینے میں حرص کی آگ سُلگتی ہے اور آنکھوں سے خود غرضی ٹپکتی ہے۔ ورنہ تو دیکھتا کہ تو فرشتوں سے قلیوں کا کام لے رہا ہے۔

دردِ دل ہی لذّتِ حیات ہے۔

لیکن او دنی فطرت، اس جوہرِ انسانیت کو تو اپنے نفس پر قربان کر رہا ہے۔

تجھے خبر نہیں کہ حرص و ہوا کا جنگل تجھے تیزی سے موت کے غار کی طرف ڈھکیل رہا ہے۔

گُناہ

میں مساوات کے گیت گاتا ہوں۔

سب گنہگار میرے ہی بھائی بہن ہیں۔

اور میں؟ — میں تو دریائے معاصی میں ڈوبتے تیرتے پاپیوں کا سردار ہوں۔

تینتیس کروڑ دیوتاؤں کے بارِ گنہ سے جہنم دبا جا رہا ہے۔ لیکن انھیں کے نقشِ قدم پر چل کر ملائک نے بہشت کی راہ پہچانی ہے

آدم سے لے کر نذر الاسلام تک — ہر فرد بشر نے عذاب کی چھُری سے ثواب کا گلا ریتا ہے۔

یہ تو پاپیوں کی بستی ہے۔

اس کے آدھے حِصّے پر خدا کی حکمرانی ہے اور آدھے پر شیطان کی کارفرمائی۔

مذہبی دیوانو، سنو! دوسروں کی آنکھوں کا تنکا دیکھنے سے پہلے اپنی آنکھوں کے شہتیر کو تو دیکھو۔

نیکی کے پودے پر صرف گناہ کے پھول کھلتے ہیں۔

اس جہانِ جمیل میں فریب و معاصی کے سوا رکھا ہی کیا ہے

کوئی اوتار اور کوئی پیغمبر اپنے کو بے داغ نہ رکھ سکا۔

اس نے اپنی روح اگر ثواب کے سپرد کی تو اپنا جسم گناہ کے حوالے کیا۔

ہمدم، یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ برہما، وشنو اور مہادیو

انسان کا ذکر ہی کیا ہے، بڑے بڑے رشی منی
جیسے جُغادری — ان سب کی روح سے ریا ہو تو ہو، لیکن ان کے کالبد
خاکی لہو و لعب کے پُتلے تھے۔

یہ دنیا سیہ خانہ ہے جہاں خرِ مذہب کی پیٹھ پر ثواب کا
خوشنما پالان پڑا ہوا ہے۔

یہاں سب پُرانے پاپی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک اپنے
گناہ کے ترازو پر دوسروں کی بدکاریوں کو تولتا ہے۔

چوٹی اور ڈاڑھی کے پردے میں کیا تم اپنی ریاکاری کو
چھپا سکتے ہو؟

پولیس کا وجود جس طرح چوروں کی موجودگی کا پتا دیتا ہے
اسی طرح یہ پُر فریب وضع تمھاری سیاہ کاریوں پر دلالت
کرتی ہے۔

ایک روز فردوسِ بریں میں معصوم فرشتوں نے احتجاجی جلسہ
کیا۔ موضوعِ بحث یہ تھا کہ اللہ میاں ہماری عبادت سے تو
بے نیاز رہتے ہیں لیکن ان کی تمام رحمت اس خاکی، عاصی ناری
انسان کی طرف متوجہ رہتی ہے۔

یہ شکوہ خالق کے کانوں تک پہنچا تو اس نے مسکرا کر کہا کہ
"اس خاک کے پُتلے نے کمال نازک دل پایا ہے، اس کی دنیا
میں ہر پھول کانٹوں سے چھدا ہوا ہے۔

ہر نین میں جادو ہے اور ہر لب لالیں زہرِ ہلاہل میں ڈوبا

ہوا ہے۔ وہاں صندل بھی تپ آرزو میں مبتلا ہے۔ اور چاند بھی پوسوں کی گرمی سے سیاہ پڑ رہا ہے۔

وہاں پر حسین آنکھوں میں کاجل لگائے گلے میں چندن ہار ڈالے پیروں میں مہندی لگائے ہونٹوں کو خون آلود کیے —— عالم کو تہ و بالا کرنے کے درپے ہے۔

اس دنیا میں شیطان حسن کی پوشش میں ملبوس ہے اور حسن کی نگاہوں میں تیر ہے تو مسکراہٹ میں انی ہے۔"

یہ سن کر فرشتوں نے کہا کہ معبود ہمیں بھی ٹک اس جہان کی سیر کرا دے۔ جہاں پھول اس لیے کھلتے ہیں کہ کملائیں، مرجھائیں اور پھر پیوند خاک ہو جائیں۔

دربارِ باری سے ارشاد ہوا کہ تم میں سے دو جو سب سے افضل ہیں اس خاک دان کی طرف جائیں اور فریبِ ہستی کا تماشہ دیکھیں۔

اجازت ملتے ہی ہاروت اور ماروت، ٹوٹے ہوئے ستاروں کی طرح آسمان سے زمین پر اترے۔

یہاں آ کر کیا دیکھتے ہیں کہ ذرّہ ذرّہ دام تزویر ہے۔ پتّا پتّا نقش فریب ہے۔ آسمان پر تو فقط ایک ہی مہتاب جلوہ ساماں ہے لیکن آبِ دریا میں اس کی صدہا پرچھائیاں اتر آئی ہیں۔

یہاں کی ہر صدا، ہر رنگ و بو حسن خوں آشام کی تفسیر ہے۔ جس گھاٹ پر دیکھو روپ کی گگری کھلکھلا رہی ہے۔ لیکن اس کی صدائے بازگشت بانسری کے سُروں میں فریاد بن گئی ہے۔

دو دن کے اندر ان آتش نفس فرشتوں کی رگ رگ میں مٹی
کا رس سما گیا اور ان کے دل ایک جادو نظر کے گرفتار ہوگئے۔
جب زہرہ لہنگا پھڑکا کر اور گگری چھلکا کر سامنے سے نکل گئی
تو ان خلد نشینوں کے پیروں میں عشق کی زنجیر پڑگئی۔
آتشِ جہنم کا خوف لبِ شکریں کی شیرینی میں سرد ہوگیا۔
اور شرابِ کوثر کا لطف مٹی کے پیالوں کے آگے ہیچ ہوگیا۔
وہ ریاضت اور عبادت کہاں گئی ہے۔ اب خدا کے ان
جلیسانِ خاص کو دیکھو کس مزے سے ساغر لنڈھا رہے ہیں۔
ادھر اللہ میاں نے فرشتوں پر طعن کس کر کہا دیکھو زمینِ لئیم
نے ہاروت اور ماروت کا کیا حشر کیا؟
ہم نشیں! یہاں ایک ایک جادو بھرے نین میں وہ قدرت
ہے کہ اس کے ایک اشارے کے سیل میں مدّتوں کا زہر تنکے کی
طرح بہ جاتا ہے۔
مادرِ گیتی کا حُسن سدا بہار ہے
اور اس پر کسی جبّار اور قہّار کا حکم نہیں چلتا۔ بلکہ اس پر
محبت کا دیوتا اپنی رانی کے ساتھ فرماں روائی کرتا ہے۔

طوائف

تجھے طوائف کہہ کر کون حقارت سے ٹھکراتا ہے؟ ممکن ہے تو سیتا جیسی کسی ہستی کی بیٹی ہو۔

تو جو بھی ہو، ہماری ماؤں، بہنوں کی ہم جنس تو ہے۔

تیرے بچّے بھی ہم جیسے ہیں۔ شاید کہ ہمارا ہی کوئی ماموں اور چچا ان کا باپ ہو۔ کیا عجب کہ ان کے چہرے پر ان کا عکسِ رُخ نظر آجائے۔ وہ بھی توقیر اور عزّت حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کی آواز بھی روح القدس سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔ پیدائش کے بعد انسان سے نفرت صریح کفر ہے۔

کیا گناہ کا مرتکب کبھی ثواب نہیں کر سکتا؟ اگر اہلیا[1] کو نجات حاصل ہو سکتی تھی اور میری[2] عصمت کی دیوی بن سکتی تھی تو

---

[1] "اہلیا" گوتم رشی کی حسین وجمیل بیوی تھی جس پر اندر دیوتا سوجان سے فریفتہ ہو گئے۔ ان دونوں کی خفیہ محبت کا پتہ چلنے پر رشی جی نے اہلیا کو بد دعا دی کہ پتھر کی مورت بن جا۔ جب رام چندر جی کے پیر اُس پر پڑے تو اس نے پھر انسانیت کا جامہ پہنا ۱۲

[2] "میری" ایک فاحشہ عورت تھی جسے زناکاری کے جرم میں لوگ سنگسار کرنا چاہتے تھے۔ جب انھوں نے مسیح سے اجازت چاہی تو انھوں نے جواب میں وہ معرکۃ الآرا جملہ کہا "جس کسی نے کبھی گناہ نہ کیا ہو پہلے وہ اس پر پتھر پھینکے"۔ بعد ازاں اس عورت نے اپنی ایسی اصلاح کی کہ لوگ اس کی پرستش کرنے لگے۔

تو بھی حق و صداقت کی راہ پر چل کر قابلِ عزّت بن سکتی ہی۔
تیری اولاد کو جو لوگ نطفۂ ناتحقیق کہ کر ٹھکراتے ہیں ان سے میں
پوچھوں گا کہ ای نیکی کے فرشتو! دنیا والوں میں سے کتنوں نے
جذبۂ شہوت کو ٹھکرایا ہی؟ ان میں سے کتنے گناہ سے پاک تھے؟ ہم سب
کو اسی شہوانی بھوک نے جنم دیا ہی لیکن کوئی ہمارے غرور کو تو
دیکھے۔

نطفۂ تحقیق ہو یا ناتحقیق ــــ وہ شہوت کا ہی انجام ہوتا ہی۔
اگر عصمت فروش ماں کا بیٹا حرامی ٹھیرا تو شہوت پرست باپ
کا بیٹا بھی یقیناً حرامی کہلائے گا۔

عورت

میری نگاہ میں مرد عورت سب برابر ہیں۔

دنیا کی حشمت اور جلال کی تعمیر میں عورت کا بھی اُتنا ہی ہاتھ ہے جتنا مرد کا۔

سوز و ساز، تپش اور خلش، آگ اور آنسو۔ ان کی تخلیق میں مرد کا اتنا ہی حصّہ ہے جتنا عورت کا۔

دیوی! تجھے گناہ کا سبب کون بتاتا ہے؟ کہہ دے گناہ کا تخم بونے والا ابلیس مرد ہی کا ہم جنس تھا۔ یا یوں کہو کہ نہ وہ مرد ہے نہ عورت بلکہ خواجہ سرا ہے۔ اور دونوں میں مل جل کر رہتا ہے۔

اس جہان میں جتنے پھول کھلتے ہیں، جتنے شجر اُبھرتے ہیں عورت نے ہی ان میں رنگ و بو شیرینی اور لطافت پیدا کی، روح پھونکی۔

ہم نشیں! تاج محل کو بھی غور سے دیکھا ہے؟ اندر ممتاز سوتی ہے، باہر شاہجہاں آرام کر رہا ہے۔

عورت دل ہے، مرد جسم ہے۔

اگر مرد سورج کی تپش اور بادِ سموم کا جھونکا ہے، تو عورت چاند کی کرن اور نسیم صبح گاہی ہے۔

اگر مرد تشنہ لب صحرائی ہے تو عورت جامِ کوثر ہے۔ مرد نے ہل چلایا، عورت نے پانی سے سینچا۔ ان دونوں کے سنجوگ سے

کھیتی لہلہا اُٹھی۔

سونے اور چاندی کی زنجیریں عورت کے جسم سے چھو کر حسین زیوروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

عورت ہی نے شاعری کی بنا ڈالی اور عورت کے ہر لفظ کو موسیقی میں بدل دیا۔

عورت سلسبیل ہے۔ مرد مجسم پیاس ہے۔

پانی اور پیاس ان دونوں کے میل سے نیا آدم پروان چڑھتا ہے۔

مرد کی ہر فتح اور نصرت عورت کی قربانی کی منت پذیر ہے۔ تاریخ یہ تو بتاتی ہے کہ کس جنگ میں مردوں نے کتنا خون بہایا لیکن یہ کون بتلائے گا کہ اس کے لیے عورتوں نے کس طرح اپنا سہاگ اُجاڑ دیا؟

ماں نے جگر پاروں کو کیسے نکال پھینکا؟ شجاعت کی داستانوں میں کہاں لکھا ہے کہ فلاں فاتح کی تلوار کو عورت کی ہمّت افزائی نے برق دم بنا دیا تھا۔ راجہ پرجا پر حکومت کرتا ہے مگر راجہ پر رانی راج کرتی ہے۔ ملکہ کی محبت، حاکم کی نخوت کو دھوتی ہے۔

اے بے درد مرد سُن، کہ عورت نے اپنا خون دے دے کر تجھے زندگی سے مالا مال کیا ہے، تاریخ جن لوگوں کے نام پر واری قربان ہوتی ہے وہ سب خود فراموشی کے ایک لمحہ میں پیدا ہوئے تھے۔

عیاش باپوں کے ذہن میں ان کا تخیل بھی نہ تھا۔

ماں کی ماممتا بچے کو رحم و کرم، الفت و محبت کا سبق پڑھاتی ہے۔

مرد کی وفا نا آشنا آنکھوں میں عورت ہی دردمندی کا کاجل لگاتی ہے۔

لیکن مرد کی احسان فراموشی تو دیکھو وہ عورت سے کس طرح پیش آتا ہے۔ جس نے اسے گود میں کھلایا اس کا گلا گھونٹتا ہے۔

جس شخص نے اپنے باپ کا حکم مان کر اپنی ماں کو قتل کر دیا اسے انسان اوتار[1] سمجھ کر پوجتا ہے۔

لیکن سُن رکھو اب وہ دن بیت گئے جب عورت مرد کی پابند تھی۔

یہ مساوات، انسانیت اور اشتراکیت کا زمانہ ہے۔

بادِ صبا یہ پیغام لائی ہے کہ غلامی کے سب بندھن ٹوٹ رہے ہیں۔ اب نہ کوئی غلام ہے نہ غلام فروش۔ اگر مرد عورتوں کو قید رکھنے کی کوشش کرے گا تو وہ دن دور نہیں کہ یہ طوق خود اس کے گلے کا پھندا بن جائے گا اور وہ آپ اپنے دام میں تڑپا کرے گا۔

دورِ حاضر للکار کر کہہ رہا ہے کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودیں گے وہ خود اسی میں گر کر مٹ جائیں گے۔

او مٹی کے بلبلو، عورت پہ جتنا تشدد روا رکھو گے اسی قدر نامرد ہوتے جاؤ گے۔

عورت بتا تو سہی، ان سنہری روپہلی بیڑیوں میں تجھے کس نے جکڑ رکھا ہے؟

---

[1] پرسرام جنھوں نے اپنے باپ کا حکم پاکر اپنی ماں کو قتل کیا تھا ۱۲

یہ کیوں ہے کہ اب تو اپنی جھجک سے آپ بھڑکتی ہے
اور تیری آواز اس خیال سے کانپتی ہے کہ اسے کوئی
سُن نہ لے۔
آج تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ بھی نہیں سکتی۔
تیرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے، پانو میں بیڑی اور چہرے
پر گھونگھٹ۔
عورت، کب تک تو اس ظلم کو برداشت کرے گی۔
توڑ دے ان پابندیوں کو، نکل آ اس زنداں سے!
یہ زیور تیری غلامی کے تمغے ہیں، انھیں مردوں کے مُنہ پر
پھینک دے۔
مادرِ گیتی کی لاڈلی بیٹی، پہاڑ اور جنگل کیوں اب تیری آواز
سے نہیں گونجتے؟
کیا یونانی سچ کہتے ہیں کہ موت کا فرشتہ ایک روز تجھے
اپنے اندھیرے تہ خانے میں قید کر آیا تھا؟
ہاں ہاں، یہی ہوا تھا، تو روزِ ازل کی زندانی ہے۔
لیکن تو ڈرتی کیوں ہے، جب تو اپنے قید خانے کی دیواروں کو
توڑ کر نکلے گی تو تیری چوڑیاں تاریک راستے کو اُجال دیں گی۔
مرد جو عزازیل کا کتا ہے، اپنے مالک کے ساتھ تیرے قدموں پہ
لوٹتا نظر آئے گا۔
عورت! اپنے نازک ہاتھوں سے دنیا کو آج تک تو نے امرت
کے پیالے پلائے تھے، لیکن اب انھیں ہاتھوں سے سم قاتل پلا دے!
پھر وہ دن دور نہ ہوگا جب آسمان مرد کے ساتھ عورت کا بھی جیکارمنانے لگے گا۔

ڈاکو

بھائی تجھ پر جو چوری کا الزام لگاتا ہے اسے یہ نہیں معلوم کہ آج بھی قانونِ کائنات ہے۔ حکومت منظّم ڈکیتی نہیں تو اور کیا ہے۔

کون ہے وہ خدائی فوج دار جو چوری کی بُرائیوں پر وعظ کہہ رہا ہے؟

اس سے کہو کہ دنیا سے ایک بھی فردِ بشر نکال کر لادے جو ڈاکو نہیں ہے۔

منصف صاحب! ان قانونوں کے پوتھوں کو طاق پر رکھیے۔

غریبوں کی جیب کاٹ کاٹ کر آج یہ سرمایہ دار جاہ مند بنے پھرتے ہیں۔

جو شخص جتنا بڑا بے ایمان، فریبی اور جعل ساز ہے ہمارے سماج میں اُتنا ہی معزز اور ہوشیار سمجھا جاتا ہے۔

رعایا کی ہڈیوں سے راجہ کے محل کی اینٹیں اور رعایا کے خون کا گارا تیار ہوتا ہے۔

حریص سرمایہ داروں کے کارخانے غریبوں کی محنت سے تیار ہوتے ہیں۔ ان کی مشینیں غریبوں کے خون سے چلتی ہیں۔

مگر ان کے چلتے ان گنت انسان بے کار ہوکر در در مارے مارے پھرتے ہیں۔

بے شمار انسانوں کو انسانیت کے حقوق سے محروم کرکے مل کا
مالک شغلِ نا و نوش میں مست رہتا ہے اور سونے کے تاروں
سے مکڑی کا جالا بنتا ہے۔
مہاجن کی توند اسی وقت بڑھ سکتی ہے جب غریب بھوکے
رہیں اور زمیندار اسی حالت میں آرام کرسکتا ہے کہ غریب کی
جھونپڑی کا دِیا بجھ گیا ہو۔
دنیا بیسوا ہے، گناہ رقص ہے، دولت سرود ہے، سرمایہ دار
تماشائی ہے۔
روٹی، صحت، اُمید اور زبان ——
انسان ان سب نعمتوں سے محروم ہے اور تباہی کی طرف
بھاگا جارہا ہے۔
اور کوئی رستہ نہیں ہے —— کیونکہ سرمایہ داری نے ہر ہر قدم
پر گڑھے کھود رکھے ہیں۔
سارا جہان زندہ ہے اور ڈاکو اس کے پہرے دار ہیں۔
چوروں نے مالکوں کو قید کر رکھا ہے کہ کہیں وہ باہر نکل کر
اپنا مال چھین نہ لیں۔
ہمدم! کون کہتا ہے کہ تو چور ہے، کون کہتا ہے کہ تو ڈاکو ہے۔
تو نے ایک مٹھی اناج کی چوری کی ہے۔ دلوں کا خون کیا ہے۔
وہ بھی ہیں جو چوری نہیں کرتے تاہم انسان نہیں ہیں۔
تو نے چوری کی ہے پھر بھی انسان ہے۔

حاکم اور محکوم

میں مساوات کے گیت گاتا ہوں جسے سن کر درد انسانی سب کو ایک ہار میں گوندھ دیتا ہے۔

اتنی سیدھی سادی بات ہے کہ جب سب ایک ہی ماں کی اولاد ہیں تو ان میں سے کوئی حاکم اور کوئی محکوم کیوں ہو۔

لیکن لوگو! یہ تماشہ دیکھو اس سیدھی سی بات کو کوئی زور سے کہہ دے تو وہ بغاوت کا مجرم ٹھہرتا ہے۔

رعایا تو حاکم کی باغی کہی جاسکتی ہے لیکن اگر حاکم ظالم ہو تو رعایا کا باغی نہیں کہا جاسکتا۔

پرجا ہی راجہ کا خالق ہے۔ راجہ رعایا کو پیدا نہیں کرتے۔

لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ رعایا کی حالت غلاموں سے بھی بد تر ہے۔

امن و امان کی قیمت ہم نے اپنی آزادی کی صورت میں ادا کی ہے۔

کس سے فریاد کریں کہ ہم اپنے ہاتھوں محل بناتے ہیں لیکن خود بے خانماں ہیں۔

جن کے لیے حکومت قایم ہوتی ہے حکومت پر ان کا ہی زور نہیں چلتا۔

راجہ اور دیوتا ہمارے منہ کا نوالہ کھا جاتے ہیں اور ہم

خود بھوکے مرتے ہیں۔
مگر یہ فریاد کس سے کیجیے۔ بھلا اسی میں ہے کہ ہم "حکومت زندہ باد" کے نعرے بلند کرتے ہیں۔
عدالت رعایا کے گناہوں کی سزا کے لیے ہے۔ حاکم تو انصاف سے بلند ہے۔

وہ دیکھو نقارۂ جنگ پر چوب پڑی!!
نونہال ہنستے ہوئے توپوں اور تلواروں پر گر پڑے اور انھیں اپنے معصوم خون کے چھینٹے دیتے لگے۔
فتح کا ناقوس بجتا ہے اور اس کی صدائے بازگشت بیواؤں کی آہ اور یتیموں کی کراہ میں سنائی دیتی ہے۔
لیکن شادمانی کا ڈھول پیٹے جاؤ کیونکہ فتح کی دیوی کا رتھ گزرنے والا ہے۔
کیا کوئی بہن اپنے بھائی کے لیے ماتم کر رہی ہے؟
کیا کوئی ماں اپنے لختِ جگر کو رو رہی ہے؟
میدانِ جنگ سے اکلوتا بیٹا نہیں لوٹا؟
شوہر موت کا شکار ہوگیا؟ بھائی کی خبر نہیں ملی؟ تو کیا ہوا؟ یہ سب شہید ہوگئے!! ان سب نے جامِ بقا پیا ہے۔
پریشان نہ ہو کیوں کہ ہماری حکومت فتح یاب ہوئی ہے!
فغاں اور فریاد کا کیا موقع ہے؟
فتح اور نصرت کا پرچم بلند کرو! بادشاہ زندہ باد کا نعرہ لگاؤ

نقارے پر ضرب لگاؤ۔
دیکھو تو سہی کہ حضورِ پُرنور کتنے عرصے کے بعد حرم سرا سے باہر تشریف لائے ہیں۔
ان زخمی سپاہیوں کی دیدہ دلیری تو دیکھو کہ ظل اللہ کی سواری کے آگے سے نہیں ہٹتے!!
یہ اندھے ہو گئے ہیں تو کیا ہوا؟ جاں بلب ہیں تو کیا؟
حکومت کی فتح! بادشاہ کی کامرانی!
ہمدم، رعایا کا خون بہتا ہے، لیکن فتح حاکم کی ہوتی ہے۔
اسی کا نام دُنیا ہے۔
سرکاری نوکروں کی تنخواہ رعایا کی جیب سے جاتی ہے۔
لیکن وہ حاکم کے نوکر ہیں، محکوم پر تشدد کرنے کے لیے۔
رعایا کے نوکر رعایا پر ظلم کرنے کے لیے ——— کیا بوالعجبی ہے!
لیکن آسمان کروٹ بدل رہا ہے۔ یہ امید امید موہوم نہیں ہے کہ بہت جلد کائنات کا ہر ذرہ محکوموں کی فتح کے ترانے گائے گا۔

——————— ❖ ———————

مزدور

اُس روز ریل میں دیکھا۔ ایک قُلی کو بابو صاحب نے دھکّا دے کر نیچے گرا دیا۔

یہ دیکھ کر دل بھر آیا، آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیا دُنیا میں غریب ہمیشہ یوں ہی ذلیل ہوتے رہیں گے؟

جو مزدور اپنے گوشت اور پوست کے ایندھن سے ریل چلاتا ہی تو وہ تو خود پٹریوں پر پڑا ہوا ہی۔ ریل پر بڑے لوگ بیٹھتے ہیں۔

کیا کہا "تنخواہ دیتے ہیں" منافقو! کہتے شرم نہیں آتی۔ مزدور کو چند پیسے دے کر تم نے دولت کے انبار لگا لیے ہیں۔

سڑکوں پر موٹر، سمندر پر جہاز، فضا میں طیارے، شہروں میں مشین یہ سب کس کے بنائے ہوئے ہیں اور کون انھیں چلاتا ہی؟ اور کون انھیں چلاتے ہیں؟

تمھارے قصر و ایوان کس کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ان کی ایک ایک اینٹ پر کس کا افسانۂ درد کندہ ہی؟ خاک کے ایک ایک ذرّے کو اس جاہ و جلال کا اصل راز معلوم ہی۔

نعرۂ انقلاب

وہ مبارک ساعت آپہنچی۔
قرض میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، اسے فوراً بے باق
کرنا ہے۔
ہتوڑی اور کُدال سے جو آسمان بوس پہاڑوں کو کاٹ
کر رکھ دیتی ہے
راستوں کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں
تمھاری خدمت کے لیے جس نے قلی اور مزدور کا پیشہ
اختیار کیا ہے
تمھاری بار برداری کے لیے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے
وہی صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔
میں اس کے گیت گاتا ہوں۔
اس کا دُکھا ہوا دل ایک نئی زندگی کی تعمیر کرے گا۔
یہ توقع نہ رکھو کہ یہ خاک نشیں صرف اسی وجہ سے تمھاری
توقیر کریں گے کہ بالا نشیں ہو۔
جو لوگ فرطِ محبت سے زمین کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے
ہیں اب یہ زمین اپنے کو انھیں کے سپرد کرے گی۔
میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں جن میں یہ خاکِ پاک
خود بخود لپٹ جاتی ہے۔

آج مظلوموں اور بےکسوں کے خون میں رنگ کر بطن گیتی
سے آفتابِ تازہ پیدا ہؤا ہے۔
اب تمام بندھنوں اور بندشوں کو توڑ کر پھینک دو۔
فلکِ کج رفتار کو چاہیے کہ پاش پاش ہو کر ہمارے آشیانے
پر گر پڑے۔
ہمارے سر پہ چاند اور ستارے پھول بن کر برس پڑیں
کہ ہم نے ایک جہانِ نو کی داغ بیل ڈالی ہے۔
ساری دنیا کے انسان سن لیں کہ ہم سب ایک ہی
کارواں کے مسافر ہیں۔
اگر ایک کو تکلیف ہوگی تو سب کے دل اس کی کھٹک
محسوس کریں گے۔ ایک کی توہین بنی نوع انسان کی توہین ہے
ایک نئی دنیا نئے ارمانوں اور نئے مقصدوں کے ساتھ
راہِ حیات پر گام زن ہو رہی ہے جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے
اور شیطان خوف سے لرزتا ہے۔

ختم شد

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu Series No. 123.

PAYĀM-I-SHABĀB

Translation of
QAZI NAZRUL ISLAM'S BENGALI POEMS

Compiled by
SYED AKHTAR HUSAIN RAIPURI

The Anjumaṇ-e-Taraqqi-e-Urdu (India),
DELHI

1939